ستیہ پال آنند

اپنی اپنی زمینیں

ان افسانوں کے تمام واقعات اور نام فرضی ہیں۔ کسی بھی حقیقی
شخصیت، نام، واقعے یا مقام سے ان کی مشابہت صرف
اتفاقی ہے اور اس سے مصنف یا ناشر پر کوئی ذمہ داری
عائد نہیں ہوتی۔

APNI APNI ZANJEER (SHORT STORIES)
BY SATYA PAL ANAND Rs. 50/-

اپنی اپنی زنجیر

اور دوسرے افسانے

ستیہ پال آنند

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولا مارکیٹ ۔ دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پروفیسر اور صدر، شعبۂ انگریزی
ڈی سی سی۔ پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ

پہلی بار : ۱۹۹۰ء
قیمت : پچاس روپے
کتابت : راحت علی خاں رامپوری
طباعت : اے ون آفسیٹ پریس، نئی دہلی ۲۱
سرورق : رزّاق ارشد

زیرِ اہتمام
پریم گوپال متل

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولامارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ہیرا نند سوز کے نام

جس کی عمر بھر کی رفاقت مجھے انگریزی سے اردو کی طرف واپس لے آئی

ترتیب

کچھ دوستوں کی آراء

مُصنّف کے فن کے بارے میں

فِکر تونسوی (دہلی)

"ستیہ پال آنند خدا نہیں ہے

خدا اور آنند میں یہ فرق ہے کہ کردار تو خدا پیدا کرتا ہے، لیکن پیدا کرنے کے بعد انھیں قطعاً بھول جاتا ہے، لیکن آنند اپنے کردار پیدا کرنے کے بعد اُن کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اُن کے دکھوں میں شامل ہوتا ہے، اُن کے زخموں پر کراہتا ہے۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں شریک ہوتا ہے اور یوں اپنی کہانی مکمل کر کے جیسے خدا سے کہتا ہے: آؤ، اب تم اور میں اپنی اپنی جگہیں بدل لیں، کیونکہ تم نہایت کم ظرف خالق تھے اور میں نہایت ہمدرد انسان۔

فِکر تونسوی

جولائی ۱۹۵۹ء

(اُردو کتاب "جینے کے لیے" کے ریویو سے اقتباس)

کنہیّا لال کپور (موگا)

"کم بخت اُردو میں ایسی کون سی بُرائی تھی کہ تم ہندی سے پریم جتا بیٹھے۔ اچھی بھلی، ناک نقشے سر خی۔ بندی رستی والی محبوبہ تھی، عشق کے قابل تھی، ابھی ماشاء اللہ جوان تھی۔ اب تم مانو گے تو نہیں، کیوں کہ یہی بات تم نے اس دن موہن راکیش اور کملیشور کے سامنے کرشن بلدیو وید

کے گھر میں بھی کمی تھی، لیکن اردو مرے گی نہیں۔ زبان کے طور پر ہمیشہ زندہ رہے گی۔

تم نے "جینے کے لیے" میں لافانی افسانے شائع کیے تھے، وہ بھولتے نہیں ہیں۔ تمہارے کون موون اور میڈم فلیس اور صبح کا بھولا سائنس دان اور وہ افسانہ جو اختر رضوانی کو ہدیۂ مشق بنا کر لکھا تھا۔ یہ کوئی بھولنے والی چیزیں ہیں؟ اب بھی وقت ہے۔ اردو میں پھر سے لکھنا شروع کر دو! تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔۔۔"

کنہیا لال کپور

۱۳ دسمبر ۱۹۶۶ء

(ذاتی خط سے اقتباس)

ملک راج آنند (بمبئی)

"شیڈوز اینڈ ٹون" کی کہانیاں اسی نامور افسانہ نگار کے قلم سے لکھی ہوئی ہیں جس نے اردو اور ہندی میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ ملک اور بیرونِ ملک کے مقتدر رسائل اور اخبارات میں چھپی یہ کہانیاں اب کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ ستیہ پال آنند کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ واقعہ اور کردار دونوں کو ایک دوسرے سے متعلق کر کے کردار کو پہلے ہمارے سامنے رکھتا ہے اور پھر اسے واقعے کے تانے بانے میں الجھا دیتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ زندگی کی مثبت قدروں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ مثال کے طور پر بیئر باؤری کی کہانی ہے جو ہم سب کے دیرینہ آنجہانی دوست ساحر لدھیانوی کا بچپن کا رفیق تھا۔ آنند نے اس کردار کو صرف ایک پلڑے میں تولا ہے۔ یعنی ساحر لدھیانوی کے ساتھ اس کی رفاقت کے پلڑے میں، جبکہ ساحر بمبئی آ کر اسے بھول گیا۔ گورکھے چوکیدار کی کہانی "تمن بہادر" نہایت طاقتور کہانی ہے۔ اپنی شاٹ گن سے جانوروں کا شکار کرنے والا گورکھا، جو ایک گورے اور اپنی لڑکی دونوں کا قاتل بھی تھا اپنے داماد کا قیمہ کر کے کتوں کو کھلانا چاہتا ہے لیکن اپنی نواسی کے پیار کی وجہ سے اسے معاف کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ انڈو اینگلو افسانوی ادب میں آنند کا داخلہ نیا نہیں ہے تو بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ ایک نئی صحت مند آواز لے کر

آیا ہے، اور یہ آواز بوڑھی نسل کے ہم سب ہندوستانی ادیبوں کے، جو انگریزی میں لکھتے ہیں، جانے کے بعد مدتوں تک زندہ رہے گی۔"

ملک راج آنند

دسمبر ۱۹۸۵ء

(انگریزی کتاب "شیڈوز ایٹ نون" کے ریویو سے اقتباس۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ)

خواجہ احمد عباس

"آپ کے افسانے 'انسان دوستی' اخوت اور زندگی کی بہترین قدروں سے عبارت ہیں۔ 'من بہادر' اور 'کیپٹو' کو پڑھ کر یوں محسوس ہوا، جیسے یہ کردار ہماری روز مرہ کی زندگی کا جزو ہوتے ہوئے بھی ہماری آنکھوں سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں اور ہم ان کا کرب، ان کی زندگی کا درد، اس لیے نہیں دیکھتے کہ وہ چپڑاسی یا چوکیدار ہونے کی وجہ سے ہمارے بہت قریب ہوتے ہیں۔ ہماری نظر دور رس اور دوربین تو ہوتی ہے، مگر قریب کی چیزوں کو دیکھنے کی عینک ہمارے پاس نہیں ہوتی — ہریانہ کی سرکاری تقریب کے بعد آپ سے جو طویل تر ملاقات چنڈی گڑھ میں ہوئی، برسوں گذرنے پر بھی اس کے نقوش دل پر باقی ہیں۔ 'سانپ اور سانپ' آپ ترتیب دے رہے ہیں۔ دیر آید درست آید — اُردو کا سرمایہ ہندی اور انگریزی لوٹ کر لے گئی تھیں، وہ واپس بمعہ سود ملنا چاہیئے۔"

(خواجہ) احمد عباس

۴؍ اپریل ۱۹۸۵ء

(ذاتی خط سے اقتباس)

کرشن چندر (بمبئی)

"غالباً ۱۹۶۲ء میں آپ نے اپنی ایک کتاب "جینے کے لیے" مجھے دی تھی۔ تب میں نے سرلا اور ریوتی سرن سے کہا تھا: یہ نوجوان بہت خوب صورت لکھتا ہے۔ تم اس کی

ہندی کی کتابیں ضرور پڑھو۔ اب آپ کی چاروں کتابیں مجھے مل گئی ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جو رائے میں نے سرلا اور ریوتی سرن کو دی تھی، اس پر خود عمل نہیں کرسکا۔ ہندی بہت خوب صورت زبان ہے، اس میں محبوبہ سے پیار کی بات تو ہو سکتی ہے لیکن نثر میں لکھی ہوئی کوئی کہانی پڑھنا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ پڑھتا ہوں تو آنکھوں پر بوجھ پڑتا ہے۔ شام سندر آپ کے چاہنے والوں میں سے ہے۔ کل اور پرسوں دو دن اُس نے کچھ کہانیاں پڑھ کر سنائیں۔ پنیشر باوری پڑھتے پڑھتے رونے لگا، کہنے لگا سریندر پرکاش نے ایک بار کہا تھا۔ لدھیانہ والا استیہ پال آنند اگر اردو میں لکھتا رہتا تو کرشن چندر کو پیچھے چھوڑ جاتا، کم بخت پروفیسر بن گیا اور اردو کو چھوڑ گیا۔ اب جب شام سندر نے یہ افسانے پڑھ کر سنائے تو محسوس ہوا کہ اکثر جھوٹ بولنے والا اور اکثر و بیشتر گالی بکنے والا سریندر پرکاش بھی کبھی کبھی سچ بول لیتا ہے...."

کرشن چندر

۹ اگست ۱۹۶۵ء

(ذاتی خط سے اقتباس)

موہن راکیش (جالندھر)

"مدت ہوئی میں نے کہانی الٰہ آباد کے کسی انک میں پنیشر باوری شیر شکار کہانی پڑھی تھی۔ کہانی میں زندگی کا رنگ کچھ ایسے انا یاس ہی اُبھر کر آ گیا تھا کہ لگتا نہیں تھا، وہ کہانی ہے۔ پڑھنے کے بعد اُس کی ایک لکیر سی من میں رہ گئی تھی۔ تب تک میں نے آنند کی اور کوئی کہانی نہیں پڑھی تھی، اور آج جب میں اُس کی کئی ایک کہانیاں پڑھ چکا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ پنیشر باوری کی وشیشتا ایک کہانی کی وشیشتا نہ ہو کر لیکھک کی ہی وشیشتا ہے، جس نے وہ کہانی لکھی ہے۔ آنند کی پرایا سبھی کہانیوں کی رچنا اسادھارن سی زندگی کے رنگوں کو لے کر ہوئی ہے۔ ہر کہانی کا آدھار بندو کوئی نہ کوئی چرتر ہے، بہت پاس سے دیکھا اور جانا پہچانا ہوا جو کہانی کو گوان کر کے سویم

آگے بڑھ جاتا ہے اور اپنی ایک چھاپ چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ پرستت سنگرہ کی کہانیوں میں "کون موہن"، "لال بادشاہ" "کیڑو" اور "منگ" ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کا ایک اپنا ہی واتاورن ہے۔ اسی واتاورن کو پرستت کرنے میں لیکھک کو کہیں کٹھن پریاس نہیں کرنا پڑا۔ اس نے اپنے دائرے سے باہر جا کر دور کے گھروں میں جھانکنے کا پریاس نہیں کیا۔ زندگی کا جو بیورا اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گذرتا ہے۔ اسی میں اُس نے اپنے لیے کچھ تصویریں چُن لی ہیں اور مانو ویوہار کے سمبندھ میں کہانی کا روپ دے دیا ہے.....۔"

موہن راکیش

——— (ہندی کتاب "بنجر باڑی" کے دیباچے سے)

راجندر سنگھ بیدی

"اب رہی کہانیوں کی بات.... میں تو آپ کی کہانیوں سے پوری طرح واقف نہیں تھا لیکن بلونت گارگی کو اپنی فکر زیادہ رہتی ہے۔ اِس لیے جب میں نے کہا تھا کہ لال بادشاہ جیسی کہانی پر ایک شارٹ فلم بنائی جا سکتی ہے، جس میں بارش کا شور ہو اور چھما چھم بارش میں ٹرکوں پر بورے لادنے اور بورے اُتارنے کے بھرپور شارٹ ہوں تو بلونت کو اپنی کہانیوں کی بابت خیال آگیا۔ اب آپ کی چنڈال چوکڑی والی کہانی کی ہی بات لیں۔ سٹائن بک کی ایک کہانی 'کینزی رڈ' پر ایک شارٹ فلم بنی تھی، جس میں چھ سات لفنگے کردار ہوتے ہیں۔ آپ کی یہ کہانی ایک شارٹ فلم کے لیے اتنی موزوں ہے کہ اگر اپنی مصروفیات سے وقت ملا اور ایک چادر میلی سی کا پراجیکٹ وقت پر ختم ہو گیا تو میں خود کوشش کروں گا کہ اس کو ہاتھ ڈالوں۔ ستیا سرحدی ایسے موضوع لیا کرتے تھے......"

راجندر سنگھ بیدی

۲ر فروری ۱۹۷۰ء

(انگریزی سے ترجمہ۔ ایک ذاتی خط سے اقتباس)

مختصر اقتباس

"......ستیہ پال آنند جیسے جاگتے کردار پیش کرتا ہے۔" جینے کے لیے" اردو ادب میں گرانقدر اضافہ ہے....."

(اردو نقاد)۔ اختر انصاری اکبرآبادی
نئی قدریں ۱۹۵۹ء

" پاتر تو ایسے ہیں، جیسے ہم آپ سبھی ہوں۔ اٹھتے، بیٹھتے، بولتے، سوتے، جاگتے۔ حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔"

(ہندی ناول نگار) بھیرو پرشاد گپت
کہانی الہ آباد۔ ۱۹۵۸ء

" پڑھ لی آپ کی پستک۔ ایک ہی بیٹھک میں سماپت کی اور تب دم لیا۔ انایاس ہی منہ سے نکلا، پنجاب کی دھرتی پر یہ کیسا شخص ہے، جو کہانی لکھتا ہے تو جیسے پڑھنے والے پر جادو کر کے اسے باندھے رکھتا ہے کہ بھئی کہانی ختم کرو، تو آگے بڑھو۔"

(ہندی ناول نگار) وشنو پربھاکر
ذاتی خط سے اقتباس ۱۹۶۰ء

" میں پنجابی لیکھکوں کو سدا یہ کہتا ہوں، کہانی لکھنے کی کلا سیکھنی ہے تو جاؤ آنند کے چرنوں میں بیٹھو۔ اب اس سے زیادہ میں کیا رائے دے سکتا ہوں، تمھاری کہانی کلا کے بارے میں۔
پنجابی نقاد۔ سنت سنگھ سیکھوں
پنجابی سے ترجمہ
ذاتی خط سے اقتباس ۱۹۷۲ء

" بھائی روس میں بھی تم نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ یہاں آ کر گورمیل پنوں نے بتایا کہ جن

کہانی کاروں کی بیشتر کہانیاں اُردو یا ہندی سے روسی زبان میں ترجمہ ہوئی ہیں اُن میں سے چھ سات تو صرف تمہاری ہی ہیں۔"

پنجابی افسانہ نگار ـــ نوتیج سنگھ

۱۹۶۵

ذاتی خط سے اقتباس

"اگر میں یہ کہوں کہ تم سلیپنگ جائنٹ (سوئے ہوئے دیو) ہو، جو جاگے گا تو ایک بار پھر اردو میں تہلکہ مچادے گا، تو یہ بات غلط نہیں ہوگی۔"۔

اردو افسانہ نگار ـــ رام لال

۱۹۶۹

ذاتی خط سے اقتباس

"دل کی بستی' کے سبھی افسانے بھرپور تاثر چھوڑتے ہیں۔ حیرت ہے چینی حملے جیسے ایک موضوع کو لے کر آپ نے تین اتنی اہم کہانیاں کیسے لکھ لیں۔ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔"

اُردو افسانہ نگار ـــ جوگندر پال

۱۹۶۸ء

ذاتی خط سے اقتباس

"آپ خود مجھ سے بہتر لکھتے ہیں۔ میں کیا رائے دوں۔ یہی کہوں گا کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!"

اردو ہندی مصنف ـــ دیوندر ستیارتھی

۱۹۶۸ء

ذاتی خط سے اقتباس

سانپ اور سانپ

بیڑی سلگا کر کش لگاتے ہوئے تارو چبوترے پر جم کر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی ابھی گرم گرم گڑ کی چائے پی کر نکلا تھا، اس لیے اس کے سانس سے بھاپ اُڑ رہی تھی۔ "ہمیں کیا، بھیما جائے یا پرتاپو آئے! ہماری گدّی تو قایم ہے بے۔" اُس نے بیڑی کا گہرا کش لے کر خود سے کہا اور پھر پیٹر گھسیٹا رام کے دروازے سے نکلتی ہوئی سانولی سی لڑکی کو دیکھنے لگا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ پیٹر گھسیٹا رام کی بہن ہے اور وہ لوگوں پر اپنی داشتہ ظاہر کر کے اس سے پیشہ کرواتا ہے۔ تارو نے دائیں بائیں دیکھا۔ اس سے بات چھیڑنے کے لیے ابھی کوئی بے فکرا گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ سردی سے ٹھٹھرتا ہوا ایک خارش زدہ کتا ضرور اس کے سامنے کھڑا دم ہلا رہا تھا۔ اُس نے اسے پچکارا اور پھر ہونٹوں میں ہی کہا۔ "بلی، تم جانتے ہو کہ جس لڑکی کو پیٹر گھسیٹا رام نے ڈولی رُلیا مل کا نام دے رکھا ہے کون ہے؟ یہ سالے کی اپنی سگی بہن ہے۔ یہ ٹی بی کی مریض ہے اور جب یہ اُسے اپنی بیماری کا واسطہ دے کر پیشہ کرنے سے انکار کرتی ہے تو یہ حرامی اُسے پیٹتا ہے.... بلی بیٹے، یہ رات بھر کی تھکی ماندی گھر پہنچی ہے اور اب دکان سے ڈبل روٹی اور مکھن خریدنے جا رہی ہے۔ جانتا ہے نا حرامی کا پلا کہ بچن سنگھ ڈیری والا اسے ڈبل روٹی، دودھ اور مکھن مفت میں دے دے گا۔

تف تف ..... تھو ہے اس کمینے پر ! اُس نے تھوک دیا۔ کتّے نے اُس کی تھوک سونگھ کر دیکھا اور پھر نا امید ہو کر ذرا دُوری پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

محلے کے لوگ اب جاگنے لگے تھے۔ جس چبوترے پر وہ بیٹھا تھا' اس سے ذرا دُوری پر پانی کا نل تھا جس کے ارد گرد کیچڑ جمی گندگی پر کیلے کے چھلکے بچھے رہتے تھے۔ تارو کے پاؤں کے پاس بھی ایک چھلکا پڑا تھا۔ اس نے اُسے اٹھا کر بالکل راستے کے بیچ میں پھینک دیا اور پھر دائیں بائیں دیکھ کر معصومیت سے ہاتھ جھاڑ لیے۔ کتّے نے چھلکے کو بھی سونگھ کر دیکھا اور پھر بالکل نا اُمید ہو کر گلی میں چلنے لگا۔

ابھی تک تارو کے بے فکرے اور گپّی ساتھیوں میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ دھوپ اب چبوترے پر بکھرنے لگی تھی۔ وہ سرک کر دھوپ میں ہو بیٹھا۔ گھروں سے مَردوں' عورتوں کے نہانے' اونچی اونچی آوازمیں پُوجا پاٹھ اور جاپ کرنے' برتنوں کی جھنجھناہٹ اور صبح کے وقت کی دیگر متفرق آوازیں آرہی تھیں۔

یکایک کانو حلوائی کا دروازہ کھلا اور اس کی موٹی چیچک سے بدنما چہرے والی بیوی باہر نکلی۔ ہاتھوں میں پانی بھرنے کے لیے دو بالٹیاں تھیں۔ اُس نے چبوترے کی طرف دیکھا اور پھر نفرت سے مُنہ پھیرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ تارو نے زور سے تھوک دیا۔ جیسے مُنہ میں مکھی آگئی ہو۔ پھر اُدھ جلی بیڑی نالی میں پھینک کر اس نے کہا۔" دُر پھٹے مُنہ !" اور پھر گھسیٹا رام کے اُدھ کھلے دروازے کی طرف دیکھنے لگا جس میں کڑوے دھوئیں کے بادل نکل رہے تھے۔ "اب سالے کی دوسری بہن لوسی چولھا جلارہی ہوگی۔" اس نے پھر بڑبڑا کر کہا' لیکن اب اس کی بات سننے کے لیے کتّا وہاں نہیں تھا۔

گلی کے ایک سرے اس کا لنگوٹیا یار کسنا آرہا تھا۔ تارو دن کے شروع ہونے کی خوشی میں ایک بار کھانسا۔ پھر اُس نے چور نظروں سے رام سرن لکڑی اور کوئلہ سٹال والے کو دیکھا جو گلی کے دوسرے سرے سے چابیوں کا گچھا انگلیوں میں گھماتا آرہا تھا۔ رام سرن اچھا بھلا

شریف آدمی تھا۔ اس کے دو بچے تھے، جو روزانہ تانگے میں سوار ہو کر کانونٹ سکول میں پڑھنے جایا کرتے تھے اس کی آمدنی خاصی تھی اور وہ محلے بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، لیکن بے فکروں کے اس گروہ نے اُس کی بھی ایک کمزوری ڈھونڈھ ہی لی تھی۔ رام سرن کی شادی انھوں نے سُنا تھا کہ نو برس کی عمر میں ہی ہو گئی تھی، اور جب اس کی بیوی پہلی بار سسرال میں آئی تھی تو اُسے علم نہیں تھا کہ خاوند بیوی کا رشتہ کیا ہوتا ہے اور خاوند بیوی کو کیا کہہ کر بُلاتا ہے۔ اُس نے معصومیت میں اپنی ماں سے پُوچھا تھا کہ وہ اُسے کیا کہہ کر پکارا کرے۔ بھابی یا بہن۔ کیونکہ اس کے خیال میں دنیا میں صرف یہی دو رشتے تھے۔

رام سرن اس کے پاس سے ہو کر نکلنے لگا تو تارو نے منہ دوسری طرف کر کے کہا۔ ”بھابی، بھیں ایں ایں ایں ....“

”بھیں ایں ایں“ کو اُس نے کچھ یوں لمبا کر کے کہا کہ نل پر پانی بھرتی ہوئی کالو حلوائی کی بیوی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ایک عورت کے سامنے رام سرن اپنی بے عزتی برداشت نہ کر سکا اور اُس نے رُکے بغیر ہی دو چار کھری کھوٹی سُنا دیں۔

”آوارہ، لوفر، غنڈہ! راہ چلتے لوگوں کی پگڑی اُچھالتا ہے، نہ کام نہ کاج .....“ سامنے سے کِسنا آرہا تھا۔ جب وہ اُس کے پاس سے بڑبڑاتا ہوا گذر گیا تو کِسنا نے رُک کر اور منہ دوسری طرف کر کے آواز دی ۔ ”بھابی، بھیں ...!“

کالو حلوائی کی بیوی پر میشوری اس تماشے سے لطف اُٹھاتی ہوئی، بالٹیاں اُٹھائے، جونہی گھر جانے کے لیے چلی تو راستے میں پڑے کیلے کے چھلکے سے اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ بُری طرح گری۔ دونوں اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے اس کی طرف بھاگے۔ تھل تھل پل پل جسم کو چاروں شانے چت پڑے دیکھ کر کتا بھی بھونکنے لگا۔

”کیا ہوا بھابی؟“ دونوں نے پاس پہنچ کر اُسے کہا۔ ”ارے چوٹ تو نہیں لگی؟ جانے کون ماں کا یار یہاں کیلے کے چھلکے پھینک جاتا ہے۔!“

ٹھنڈا پانی اُس کے کپڑوں پر پڑ گیا تھا اور وہ کیچڑ میں لت پت ہو گئی تھی، پھر بھی اُس نے اُن کی مدد پسند نہ کی اور اُٹھتے ہوئے بولی، ”دُور رہو چنڈالو! اِدھر آتے جاتے کو

چھیڑتے ہو! موئے، بیکار، مونڈی کاٹے، سارا دن چبوترے پر بیٹھ کر گپیں ہانکتے ہیں اور مکھیاں مارتے ہیں۔ دور ہٹو، مجھے مت چھوؤ چنڈالو۔!"

"بھابی، تمھاری گالیاں ہیں کہاں ہیں؟ ہمارا تو جنم جنم سنور جاتا ہے ان سے۔ سچ مانو تو کالو بھائی کے رس گلے بھی اتنے میٹھے نہیں ہوتے جتنی تمھاری گالیاں۔"

اور وہ دونوں ہنستے ہوئے واپس اپنی مخصوص جگہ پر جا بیٹھے۔

دھوپ اب خوب پھیل چکی تھی۔ گلی میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ پیٹر گھسیٹا رام کی بہن مکھن اور ڈبل روٹی لیے ہوئے واپس آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ ویران تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور کپڑوں میں سلوٹیں تھیں۔ لگتا تھا کہ بچن سنگھ نے سامان اسے مفت میں نہیں دیا تھا۔

"ارے او مس فتو جان، ذرا پیٹر کو بھیجنا!" کسنا نے پکار کر کہا۔ اور جب وہ بغیر جواب دیے صرف ایک گھائل نظر ان پر ڈال کر ان کے پاس سے گذر گئی اور گھر کے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا تو کسنا زور زور سے ہنسنے لگا۔

"اسے مت چھیڑا کرو کسنے....." تارو نے کہا۔ "مجھے اس پر رحم آتا ہے!"

کسنا کے جواب دینے سے پیشتر ہی کالو حلوائی کسی کام سے باہر نکلا۔ تارو نے بڑی سنجیدگی سے کسنا کو آنکھ دبا کر کہا۔ "چینی کا کنٹرول سنا ہے ٹوٹ گیا ہے.... اب تو بلیک بند ہو جائے گی۔"

"ہاں بھیا، کمر ٹوٹے گی اب ان کی۔" بارو نے پاس آتے ہوئے کہا۔ وہ ان کی چنڈال چوکڑی کا تیسرا رکن تھا۔

بارو کے آتے ہی انھیں کالو حلوائی سے چھیڑ چھاڑ بھول گئی۔ تارو نے اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہا۔ "کہاں تھا بے بینگن کی کانی اولاد؟"

بارو کی ڈیڑھ آنکھ تھی۔ اس لیے اسے کانا کہنے میں مزہ آتا تھا۔ لیکن بارو ہنستا ہی رہتا۔ بولا۔ "پھر تم نے میری آنکھ کا مذاق اڑایا۔ استاد۔ تم مجھ سے چھوٹے ہو۔ اس لیے کہتا ہوں کہ ادب سے بات کیا کرو۔ ہاں، تم نے پوچھا ہے کہ کل کہاں تھا..... رام بن گیا تھا ذرا۔

ایک پورا پہنچا ہوا سادھو آیا ہے۔ گھوری دل کا سادھو ہے۔ کھوپری کا ہی میں پانی پیتا ہے اور کھوپری میں ہی چاول پکا کر کھاتا ہے۔ کل شام جمالے نے بتایا، تو سوچا درشن کر ہی آؤں۔"

"تو درشن کیے؟" کرسنا نے ایک آنکھ دبا کر پوچھا۔

"درشن دُرلبھ ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔۔" تارو نے مڑ کر گذرتی ہوئی رام پیاری دائی کی طرف دیکھا اور پھر پکار کر کہا۔ "موت لہو جھاگ جھال۔۔۔!"

"موت لہو جھاگ جھال!" باقی کے دونوں نے کورس میں دہرایا اور ساتھ ہی کہا۔ "ہری اوم، ہری اوم!"

تینوں اپنا اپنا پارٹ ادا کرنے کے بعد زور زور سے ہنسنے لگے۔

یہ فقرہ رام پیاری دائی کو چڑانے کے لیے کہا گیا تھا۔ رام پیاری کا اپنے نکھٹو خاوند ہری اوم سے اکثر جھگڑا رہتا تھا۔ اور ایک بار ان چاروں نے اس ادھیڑ عمر عورت کو اُلّو بنا کر اُس سے ہمدردی جتائی تھی تو بیچاری دائی کا پیشہ کرنے والی اور محنت سے کما کر کنبے کا پیٹ پالنے والی اس عورت کے منہ سے نکل گیا تھا۔ "کیا کروں، جو روپیہ موت لہو جھاگ جھال کر لاتی ہوں، مشٹنڈہ لے جاتا ہے۔" اُس دن سے رام پیاری دائی کو چڑانے کے لیے ان کے ہاتھ میں ایک انمول فقرہ آ گیا تھا۔

رام پیاری آنچل سمیٹتی چپ چاپ گذر گئی تو بات چیت مڑ کر اسی موضوع پر آ گئی۔ تارو نے پوچھا۔ "ہاں تو یارو، تم اس سادھو کی بات کر رہے تھے۔"

"بس کچھ نہ پوچھو بھیا۔ سادھو تو پورا پہنچا ہوا دکھائی پڑتا ہے۔ میں نے یونہی ذرا اُس کی قابلیت اور گیان جاننے کے لیے ویدوں کی بات چلائی تو کہنے لگا، 'تو کیا جانے بیٹا۔ اصلی وید تو پہلی لام سے بھی بہت پہلے جرمن لے گیا تھا، بنارس کے لالچی پنڈوں سے خرید کر۔۔۔۔۔۔'

بات بڑی معرکے کی تھی۔ کرسنا نے سانس روک کر پوچھا۔ "تب؟"

"۔۔۔۔۔۔ اور اپنے سوامی دیانند سرسوتی جی نے منگوائے تھے واپس، ورنہ کون جانے، بھارت کی ایک انمول چیز وہیں بدیش میں رہ جاتی۔ تب میں نے پوچھا کہ جرمن نے آخر

ہمارے ویدوں سے لینا کیا تھا تو ہمارے سادھو مہاراج ہنس کر کہنے لگے۔ بھولے ہو نا؟ ارے جرمن بھی تو ہمارا آریہ، ہندو بھائی ہے۔ یہ نئے ہوائی جہاز، ہتھیار، اڑن بموں کے نسخے ویدوں سے ہی تو سیکھے ہیں جرمن نے!"

تارو اور کِسنا کی آنکھیں کپاٹ سی کھل گئیں۔ کِسنا بول اٹھا" یہ بات!"

"ہاں، اور بات سچ بھی ہے کِسنا..... رام جانے، میرا دل تو پہلے بھی یہی کہتا تھا کہ یہ اُن کا گنیش جی کا نشان یعنی سواستک ہمارا ہی ہے۔ ارے بھائی۔ اگر جرمن انگریزوں کا مامانہ ہوتا تو ولایت کو نہ جانے کب سے اُڑا چکا ہوتا۔"

کِسنا اور تارو دونوں ان باتوں سے بہت متاثر دکھائی دیے۔ کِسنا کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پیٹر گھسیٹا رام اپنے دروازے سے لنگڑاتے ہوئے باہر نکلا۔ اس کی آنکھیں لال تھیں اور چہرے پر جا بجا تیزاب کے جلے ہوئے داغ تھے۔ اس کے نچلے بدنما ہونٹ پر تازہ مکھن اب بھی لگا ہوا تھا۔ اس نے آکر پوچھا۔

"کِشنا بھائی، تم نے مجھے بُلایا تھا؟"

تارو نے ناک سکوڑ کر کہا" کِسنا نے نہیں، میں نے تمھیں بلایا تھا پیٹر....." اور ساتھ ہی وہ چبوترے سے اٹھ کھڑا ہوا" کل رات تمھارے گھر میں کسی کو مار پڑی تھی؟"

پیٹر نے ایک لمحہ اپنے مدِمقابل کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کو پکڑے رہیں۔ پھر اس نے مکھن لگے ہونٹ کو خم دے کر کہا" تمھارا اس سے مطلب؟ میرے گھر میں کسی کی پٹائی ہو یا نہ ہو، تمھارا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"نہیں پیٹر......" تارو نے ان دونوں کے بیچ میں آتے ہوئے کہا" بات یہ ہے کہ کل شام جو میں کوتوالی کے سامنے سے گذرنے لگا تو منشی نجابت علی ہے نا حولدار، یار اپنا مجھے بلا کر پوچھنے لگا کہ اپنے محلے میں ڈولی گھسیٹا رام نام کی کوئی عورت ہے؟ میں نے کہا ہاں ہے، مگر اس کا نام ڈولی رلیا مل ہے اور وہ اپنے دوست پیٹر کی.... وہ.... کیا کہتے ہیں کچھ لگتی ہے۔۔ اب تم جانو پیٹر، بات تو بس اتنی سی ہی ہوئی۔ مگر تم جانتے ہو، نجابت علی خان بڑا کائیاں ہے۔ اُڑتی کے پَر کتر لیتا ہے۔ بات کوئی نہ کوئی ضرور ہو گی، کوئی رپورٹ..... کوئی ہنگامے

مار پیٹ کی شکایت ....."

پیٹر گھسیٹا رام کا رنگ زرد پڑ گیا۔ تارو نے آنکھ نیچی کر کے شریفوں کے سے انداز میں کہا۔ "منشی نجابت علی یہ بھی کہتا تھا کہ ڈولی پیٹر کی سگی بہن ہے۔ رُلیا رام سے اس کی شادی ہوئی اور بعد میں اُس نے اسے چھوڑ دیا۔ تب سے تمہارے پاس رہتی ہے اور تم نہ جانے لوگوں کو کیا کیا کہتے ہو کہ تمہاری کیا لگتی ہے!"

پیٹر کا رنگ فق پڑ گیا تھا۔ اُس نے ایک بار بارو سے تارو کی طرف اور تارو سے بارو کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا، پھر لنگڑاتا ہوا چُپ چاپ گھر واپس چلا گیا۔

تارو نے کہا۔ "رات مار مار کر اُدھ مُوا کر دیا ہے بے چاری کو تو بھی وہ دوسرے گاہک کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر نہیں جاتی تھی ..... اور کہتے ہیں کہ اسے دق کی بیماری ہو گئی ہے۔ خدا کا خوف بھی نہیں سالے کو۔ ہر اتوار کو گرجا گھر ضرور جاتا ہے!" اس نے زور سے تھوک دیا۔

دھوپ اب خوب کھِل اُٹھی تھی۔ گلی میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ نل پر پانی بھرنے والی عورتوں کی گنتی تو زیادہ تھی ہی۔ اگر کچھ کمی تھی تو کھیلنے والے بچّوں کی، تو وہ بھی بلّو اور لالی کے آنے سے پوری ہو گئی۔ بلّو اور لالی کرشن لال تار بابو کے لڑکے تھے، جن کی عمر ابھی سکول جانے کی نہیں ہوئی تھی۔ دونوں کے ہاتھوں میں رنگ کی پچکاریاں تھیں اور وہ کچا ہلکا رنگ ایک دوسرے پر پھینک رہے تھے۔

"ہولیاں شروع ہو گئیں بے؟" کِسنا نے بلّو کو پکار کر پوچھا۔

"ہاں چاچا، آج تیسری ہولی ہے۔" بلّو نے جواب دیا اور ساتھ ہی اس پر رنگ پھینکنے کے لیے پچکاری اُٹھائی۔

"نہ بچّے، آج نہیں، آخری ہولی کے دن!" بارو نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے روک دیا اور پھر بیڑی سُلگاتے ہوئے بڑے رازدارانہ انداز میں بولا۔ "آج صبح کی خاص خبر تو میں سُنانا ہی بھول گیا ..... اُس سالے گھسیٹا رام کے سامنے سُنانا چاہیے تھی۔"

"تو اب سُنا دے بارو ـــــ لے ادھر سروپا بھی آ گیا۔" تارو نے چوکڑی کے چوتھے رُکن کی آمد کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ "سروپ بھیّا، تمہاری بڑی لمبی عمر ہے، تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔"

"کام میں پھنس گیا تھا برادرم۔ یہ پنڈت جی ہیں نا اپنے رادھے نارائن، ان کا لڑکا گھر سے بھاگ گیا ہے، دو ہزار روپے چرا کر۔ وہیں رہا سویرے سے لے کر اب تک!"

وہ بیٹھ گیا تو بارو نے اپنی سلگائی ہوئی بیڑی اُسے تھمادی اور پوچھا۔" رادھے نارائن تو بڑا غریب سا پنڈت ہے۔ اُس کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آیا؟"

"بھولے ہو بارو تم بھی! ارے اپنے بوڑھے امیر سسر کو زہر کس لیے دیا تھا اس نے؟ ہاں، تم کیا خبر سنانے والے تھے؟"

بارو نے بیٹر گھسیٹا رام کے گھر کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔" سسرے کی بہن سویرے سویرے بچن سنگھ ڈیری والے کے اندر کے کمرے میں گھس رہی تھی۔ وہ اُسے بازو سے پکڑے ہوئے تھا۔!"

تارو نے زور سے زمین پر تھوک دیا۔ "چھوڑ پیارے۔ بات گندی، زبان گندی! کسی دن پہنچ جائے گا یہ بھی کرسٹانوں کے دوزخ میں!"

(۲)

یہ روز کی بات تھی۔

تارو، بارو، سروپا اور کرنا، ایک ہی محلّے کے چار بے فکرے اپنے گھروں سے پیٹ بھر روٹی کھاتے ہی سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اس چبوترے پر آ بیٹھتے۔ محلّے کے بوڑھوں، جوانوں، مردوں، عورتوں کی کمزوریاں ان سے چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ وہ شہر کی ہر خبر کے ساتھ براہِ راست تعلّق رکھتے تھے۔ اگر کوئی شریف قسم کا آدمی اُن کی گرفت میں نہ آتا تو بھی وہ کسی نہ کسی طرح اس کو چڑانے کا سامان پیدا کر ہی لیتے تھے۔ گالیاں کھاتے، لیکن چوں تک نہ کرتے۔

مشہور تھا کہ سوتے میں بھی ان کی ایک ایک آنکھ کھلی رہتی ہے۔

تارو کا اصل نام اوتار سنگھ تھا۔ وہ سردار موہن سنگھ کا پہلوٹھی کا لڑکا تھا۔ بارہ برس کی عمر میں ہی وہ بال منڈوا کر ننگے سادھوؤں کی ایک ٹولی کے ساتھ گھر سے نکل گیا تھا۔ دو برسوں

کے بعد جب وہ واپس آیا تھا تو اُسے کئی ہُنر معلوم تھے۔ سانپ پکڑنے کے فن میں وہ ماہر تھا۔ کچھ پلوں میں ہی وہ اپنے پھُو منتر سے گھروں میں سے سانپ نکالتا اور پھر درجنوں لوگوں کے سامنے ہی انھیں اپنے 'دوشس' اگر کے گلے میں ڈال لیتا۔ بات مشہور تھی کہ وہ سانپ کی موجودگی کو سُونگھ لیتا ہے۔ کسی محلّے میں جاتے جاتے وہ کسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا اور اُونچی آواز میں کہتا "بہنا، تمھارے گھر میں ناگ کا باس ہے۔ چاہو تو ابھی پکڑ لوں۔ میری دکھشنا صرف پانچ روپے ہے۔" اگر گھر والے عقل مند ہوتے تو اُسی وقت پانچ روپے اُس کے سامنے رکھ کر ناگ پکڑوا لیتے، لیکن اگر وہ ضد پر اَڑ جاتے تو پھر اُن کے گھر بار بار سانپ دکھائی دینے لگتا۔ پھر تارو کی دکھشنا بھی بڑھ جاتی اور وہ پانچ روپے کے بجائے 'بیس' روپے لیتا۔ کئی لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ خود گھروں میں سانپ چھوڑ دیتا ہے اور پھر کسی بوٹی کو ہاتھ پر مل کر جب منتر پڑھتا ہے تو سانپ بوٹی کی خوشبو سے مست ہو کر واپس اُس کے پاس آجاتا ہے۔

اب اس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ وہ دیکھنے میں خوب صورت نوجوان تھا۔ ماں باپ سے کبھی اس کی بنی نہیں تھی۔ کبھی کبھار اپنی نیک کمائی میں سے کچھ روپے ماں کو دیتا۔ صبح وہ چائے پی کر گھر سے نکل آتا۔ دوپہر کا کھانا تندوری ڈھابے پر کھاتا اور شام کو دیر گئے گھر جا کر کھانا کھاتا اور ڈیوڑھی میں ہی پڑ رہتا، جہاں اُس کی چارپائی پر ایک دری ہر وقت بچھی رہتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کا باپ اس سے اس لیے ڈرتا ہے کہ اُس کی چارپائی کے پایوں کے ساتھ سانپ لپٹے رہتے ہیں، لیکن ایسا کسی نے بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔

تارو کی ماں کو محلّے والوں نے "مٹکی" نام دے رکھا تھا۔ وہ بالکل چھوٹے سے قد کی گول مٹول مٹکی سی عورت تھی۔ تارو کے باپ سردار موہن سنگھ سے اُس کی عمر بیس برس کم تھی۔ تبھی ہر برس اُن کے ہاں کوئی نہ کوئی بچّہ ضرور ہوتا۔ جس برس اُن کے ہاں بچّہ نہ ہوتا، سردار موہن سنگھ اپنی بیوی کا علاج حکیموں سے کروانے لگتا۔ تارو کی ماں اپنی پڑوسنوں پر شک کرتی کہ انھوں نے کوئی جادو ٹونا نہ کر دیا ہو۔ تارو دل میں بڑا اکڑھتا لیکن ماں باپ کے سامنے زبان نہ کھول سکتا۔ یہ اس کی کمزور رگ تھی۔ جب کوئی شخص اُس کی چھیڑ چھاڑ اور فقرے بازی سے تنگ آکر جواب میں اس پر اس بارے میں طنز کرتا تو اُسے چُپ ہوتے ہی بن پڑتی، لیکن پھر بھی تھوڑی دیر چُپ رہ کر وہ کہتا، "میرے ماں باپ کوئی نہیں ہیں۔ اِس لیے یہ طعنہ میرے لیے نہیں ہے۔

"تو کیا آسمان سے گرا تھا تو؟" ایک بار رام پیاری دائی نے اُس سے پوچھا تھا۔
"ہاں"۔ تارو نے ڈھٹائی سے جواب دیا تھا۔
"ارے مجھے کیا کہتا ہے؟" رام پیاری بولی تھی۔ "انہی ہاتھوں سے تو تمہیں جنایا تھا۔"
"موت لہو جھاگ اچھال کر..... ہیں نا؟"۔ تارو نے پھر چوٹ کی تھی اور رام پیاری کو بھاگتے ہی بن پڑی تھی۔

تارو کو اگر اس چنڈال چوکڑی کا سردار کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ہر نئی شرارت اُسے ہی سوجھتی تھی۔ جہاں دوسرے لوگوں کے سکینڈل، اُن کی کمزوریاں اور ذاتی راز وہ چٹخارے لے لے کر بیان کرتا وہاں بیٹر گھسیٹا رام کا چرچا چھڑتے ہی اس کا لہجہ تلخ ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور غصہ چنگاریاں بن کر اڑنے لگتے۔ طنز آمیز اور مزاحیہ لہجہ تلخ ہو جاتا۔ وہ اسے انسانیت کے نام پر ایک بدنما داغ سمجھتا تھا۔ ایک بھائی جو بھائی ہو کر بیمار بہن سے پیشہ کرواتا ہے۔ لیکن عجیب بات تھی کہ وہ ڈولی سے ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتا۔ کئی دنوں سے اس کے دوست دیکھ رہے تھے کہ ڈولی کے سامنے آتے ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تربتر ہو جاتی ہیں۔ وہ انھیں بھی ڈولی پر آوازے کسنے سے منع کرتا۔ ڈولی ایک لٹا ہوا قافلہ تھی جو زندگی کی اُجاڑ راہوں پر گرتا پڑتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس لیے تارو کی اس میں دلچسپی فضول تھی۔ پھر بھی اُس کے دوست دیکھتے کہ ڈولی کا ذکر آتے ہی وہ کچھ عجیب سی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ ڈولی بھی گزرتے ہوئے کبھی کبھی اس کی طرف پھڑپھڑاتی ہوئی نظروں سے دیکھتی۔ جیسے ان دونوں میں کوئی گہرا، پوشیدہ راز ہو۔

کہنا تھا تو غریب نادار والدین کا بیٹا، مگر سب جانتے تھے کہ وہ شاہ خرچ ہے۔ کبھی کبھی رام لیلا کمیٹی یا یتیم خانے کو اتنا دل کھول کر چندہ دیتا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ ایک بار اُس نے سب خرچ خود کر کے پوتریگ بھی کروایا تھا تاکہ مندر کی اونچی سیڑھیوں سے گر کر مرنے والی گائے کا پاپ محلے والوں کے سر سے دور ہو سکے۔ سب لوگ جانتے تھے کہ اس کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں لیکن اس کی غریب پروری اور دریادلی کو دیکھ کر کوئی بھی یہ بات اس کے سامنے کہنے کا حوصلہ

نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے تین دوستوں پر یہ بات بالکل واضح تھی کہ وہ کوئی ناجائز کاروبار یا جرم نہیں کرتا۔ صرف اپنی مردانہ طاقت اور جوان مردی کی کمائی کھاتا ہے" جوان مردی" کے معنی بھی اُس کی دانست میں مختلف تھے۔ دراصل کِسنا شہر کی سب سے خوب صورت، سب سے زیادہ امیر اور سب سے زیادہ مغرور طوائف نُورجہاں کا 'یار' تھا اور خرچ کے لیے اُسے روپے پیسے کی کمی قطعاً نہیں رہتی تھی۔

کِسنا اصل میں کشن چند تھا۔ وہ مِڈل فیل تھا اور انگریزی کے کچھ الفاظ بھی بول لیتا تھا۔ اُس کے والدین مر چکے تھے۔ گھر بار بوڑھی دادی چلاتی تھی۔ جسے وہ روز خرچ کے لیے پانچ سات روپے دے دیتا۔ کسنا چاروں دوستوں میں زیادہ عقل مند، زیادہ امیر اور زیادہ عزت والا تھا۔ اس کی عقل بھی باقیوں سے زیادہ تیز تھی۔ اُسے علم تھا کہ رام سرن سٹال والے کے لڑکے کانونٹ اسکول میں پڑھنے نہیں جاتے بلکہ کسی دوسرے محلے میں ایک گھٹیا سے میونسپل پرائمری اسکول میں پڑھتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ رام پیاری کے پاس ٹریننگ یافتہ دائی یعنی مڈوائف ہونے کا کوئی ڈپلومہ نہیں ہے۔ اُس کی یادداشت کے بہی کھاتے میں یہ بات بھی درج تھی کہ لالہ بوٹا مل اپنی بیوی کو روزانہ کیوں پیٹا کرتے ہیں۔ کالو حلوائی اپنی دُکان پر چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو ملازم کیوں رکھتا ہے اور اپنی بیوی سے اس کا جھگڑا دن بہ دن کیوں بڑھتا جاتا ہے اور اس جھگڑے میں اس کی دُکان پر ملازم لڑکوں کا کیا رول ہے۔

کِسنا بھی ایک طرح سے چنڈال چوکڑی کا سردار تھا۔ پولیس تک اُس کی پہنچ تھی۔ ڈپٹی کمشنر کو وہ جانتا تھا۔ باہر محلوں کے کئی غنڈے اس سے خوف کھاتے تھے۔ باوجود اس بات کے کہ اُس نے خود کبھی غنڈہ گردی نہیں کی تھی۔ جوئے کے اڈوں پر اس کے نام کی پتّی نکالی جاتی۔ شراب نکالنے کی کئی بھٹیاں صرف اُس کے رسوخ کے سہارے ہی چل رہی تھیں۔ ایک بات کے البتہ وہ سخت خلاف تھا محلّے کا کوئی لڑکا کسی راہ چلتی لڑکی کو چھیڑے، یہ اُسے گوارا نہیں تھا۔ محلّے کی کوئی نوجوان لڑکی تانک جھانک کرتی نظر آجائے۔ وہ اُس کے ماں باپ سے جا کر اُن کا ناک میں دَم کر دیتا اور اُس وقت تک چین نہ لیتا جب تک اس لڑکی کی شادی نہ ہو جائے اور وہ خود ڈولی میں بیٹھ کر بہ خیریت اُن کے محلّے سے دُور نہ چلی جائے۔

"تھڑا پالیٹکس" میں وہ سب سے کم حصّہ لیتا۔ اس کی سرگرمیاں اپنے شہر تک ہی محدود تھیں۔ پڑوسیوں میں وہ صرف اس حد تک دلچسپی لیتا جس حد تک اس کا اپنا دل اجازت دیتا۔

سروپ کِشن عُرف سروپا بالکل ان پڑھ تھا لیکن اس کی طبیعت غضب کی تھی۔ پنجابی بیت یوں پڑھتا جیسے اس میں وارث شاہ یا بُلھے شاہ کی رُوح حلول کر گئی ہو۔ وہ محلّے کے ہر جھگڑے کو سلجھانے میں مدد کرتا اور خود صُلح صفائی کے لیے اپنی خدمات حاضر کرتا، پھر جب جھگڑا ختم ہو چکتا اور فریقین ہنسنے لگتے تو وہ جھگڑے کی کہانی کو پنجابی بینتوں میں باندھ کر ایک پختہ مشق کویشر کی طرح سُناتا اور لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ کسی کا لڑکا روپے چُرا کر بھاگ جائے یا کوئی چھوٹی لڑکی میلے میں گُم ہو جائے وہ سیوادل کے ممبر کے طور پر اپنا فرض ادا کرتا۔ ڈاک خانے میں کوئی کلرک اس کا دوست تھا اور اس کی وساطت سے اُسے محلّے کے ہر شخص کی مالی حیثیت کا پتا چل گیا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا تھا کہ مایا جھیوری کی اکاؤنٹ بُک میں بائیس ہزار روپے کی کثیر رقم جمع ہے۔ جب کہ پنڈت گھسیٹا رام کے حساب میں صرف تین روپے پچاس پیسے بقایا ہیں، اور رام پیاری دائی جب مرے گی تو اس کے نکھٹو خاوند ہری اوم کو تین ہزار روپے ہاتھ لگیں گے۔ بابو ست پال جو اخبار کا اڈیٹر بنا پھرتا ہے، بالکل کنگال ہے۔ سروپا عمر میں ان سب سے بڑا تھا۔ تیس برس کی عمر تک اُس نے کبھی ایک سو روپیہ بھی ایک ساتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نہیں دیکھا تھا۔ گھر کا گزارہ اُس کی پچاس برس کی ماں نہ معلوم کیسے چلا لیتی۔ ہر روز شام کو پچیس پیسے کا ایک کیپسول لے کر کھا لیتا اور پھر رات تک بے ہوش، نشے میں بے سُدھ پڑا رہتا۔

لوگوں کے ذاتی رازوں کی نقاب کُشائی کے علاوہ وہ تھڑا پالیٹکس میں بھی خوب بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا، اکثر کہا کرتا، گورو کی بانی میں آیا ہے "جد روس پنجاب آوے۔ ٹکے سیر اَن بکاوے" اور پھر بڑا سنجیدہ بن کر کہتا۔ "وہ دن دُور نہیں رہے کہ روس پنجاب پر چڑھ دوڑے گا اور پھر چیزوں کی اتنی بہتات ہو جائے گی کہ گیہوں دو پیسوں میں ایک سیر ملے گا۔" ان باتوں میں وہ کئی دیگر سُنی سنائی باتیں بھی ملا لیتا تھا۔ کہ امیر غریب برابر ہو جائیں گے اور پھر کوئی کسی کا غلام نہیں رہے گا۔ سب کارخانے سرکار چلائے گی کھیتوں کی ملکیت سرکاری ہوگی اور سب لوگ کام کریں گے، جو کام نہیں کرے گا اُسے کھانا نہیں ملے گا۔

بھنگ پی کر یا دوائی کی کیپسول کھا کر جب وہ آسمانی خبریں لاتا تو بڑے بڑوں کے ہوش

بھی ٹھکانے آجاتے۔ ایک بار اُس نے سب کو بتایا تھا کہ انگریزوں کا بڑا لاٹ چرچل اب مسلمانوں سے مل گیا ہے، اور اُس نے اُنھیں ایسی زہریلی گولیاں دی ہیں جو وہ گائیوں کے سامنے ڈالتے ہیں اور کھاتے ہی گائیں مرجاتی ہیں۔ جب کسی نے اُس سے کہا کہ مسلمان بھی تو ہندوستانی ہیں اور ہندو مسلم سب بھائی بھائی ہیں تو اُس نے کہا، 'یہ بات بھی ٹھیک ہے اور مہاتما گاندھی تو بالکل یہی کہتے ہیں' لیکن انگریز لاٹ یہ نہیں چاہتا۔ ہاں البتہ مسلمان تو بہت اچھے لوگ ہیں۔ اس نے بتایا کہ کیسے عید کے موقع پر اُس کے مسلمان دوست اُسے گھر بلا کر عید کی سوئیاں کھلاتے ہیں۔ اس طرح یہ بات بھی اُس نے ہی کہی تھی کہ دو برس کی عمر سے پہلے پہلے اگر بچہ ایک بار شیرنی کا دودھ پی لے تو اس میں شیر کی سی طاقت آجاتی ہے اور مدراسی سرکس والے یہ دودھ پانسو روپے فی سیر کے حساب سے بیچتے بھی ہیں۔

بارو کا نام بھارو سے بگڑ کر بنا تھا۔ اُس کا جسم بھاری بھر کم تھا لیکن عقل تیز تھی۔ مذاق میں ایسے باریک نقطے پیدا کرتا کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ وہ سادھوؤں، سنتوں اور فقیروں کا بڑا مُرید تھا اور اُن سے گھڑ دوڑ میں نکلنے والے نمبر پوچھنے کے لیے اُن کی خدمت میں لگا رہتا۔ اس کا دڑے کے نمبروں پر روپیہ لگانے کا شوق پاگل پن کی حد تک بڑھ چکا تھا۔ ابھی گذشتہ دنوں ایک گھوری سادھو سے اُس کی جان پہچان ہوئی تھی۔ اس سادھو کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ پانی بالکل نہیں پیتا تھا اور دن میں صرف دو بار بولتا تھا۔ بارو کی شردھا اتنی زیادہ تھی اور وہ اس کی خدمت میں اس قدر مصروف ہوا کہ سادھو مہاراج خوش ہوگئے اور انھوں نے اسے نمبر بتلانے کی شرط یہ رکھی کہ بارو کہیں سے ایک یا پانچ برس کا بچہ اُنھیں 'بلی' کے لیے لا کردے۔ بارو اپنی شردھا کے باوجود اتنا غیض و غضب میں آگیا اور چمٹے سے سادھو مہاراج کی ایسی گت بنائی کہ اُسے بھاگتے ہی بن پڑی تھی۔

بارو کا اصلی نام کوڑو رام تھا۔ کچھ لوگ اُسے اُودے چند بھی کہتے تھے۔ ماں باپ نے شاید اس کا نام یہی رکھا تھا۔ کچھ برس پہلے اُس نے شاعری بھی شروع کی تھی اور ایک بوڑھے شاعر کے پاؤں داب داب کر ایک عدد 'تخلص' بھی پایا تھا۔ تخلص تھا تشنہ۔ لیکن یار لوگوں

نے جب اس کا پنجابی ترجمہ کر کے اُسے "پیاسا" یا "ترھایا" کہنا شروع کیا تو اُس نے شاعری چھوڑ دی۔ ایک وجہ اور بھی تھی۔ ایک بار، کہتے ہیں، کِسنا نے بسیار اصرار کے بعد، بائی جی کو اُس کی غزل گانے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن غزل اتنی بھدی تھی کہ سامعین اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

اس کے بارے میں ایک اور بات بھی مشہور تھی کہ اُس نے زندگی میں تین چیزیں کبھی نہیں دیکھی تھیں، عورت بستر میں، روپیہ جیب میں اور ہاتھ کام میں۔ کام وہ کر بھی کیا سکتا تھا؛ کچھ عرصہ وہ کانگرس پارٹی میں بھی رہا تھا اور ایک بار جیل بھی ہو آیا تھا، لیکن جیل میں چونکہ بھنگ اور نشے کے کیپسول منگوانے میں دِقّت پیش آتی تھی، اس لیے وہ معافی مانگ کر رہا ہو گیا تھا۔

اُسے بھی تھوڑا پالیٹکس سے دلچسپی تھی۔ بارو ہی تھا جس نے سب سے پہلے لوگوں کو بتایا تھا کہ کشمیر کے مرحوم مہاراجا کی بارہ سو رانیاں تھیں اور وہ ہر تیسرے دن ایک نئی شادی رچاتا تھا۔ کئی رانیاں تو اس کی شکل صرف شادی کے دن ہی دیکھتی تھیں اور بس! پھر وہ بھول جاتا تھا کہ اس نام کی کوئی عورت تھی بھی یا نہیں۔

اسی طرح یہ خبر بھی وہی لایا تھا کہ فرانس کی عورتیں ہندوستانی مردوں کو بہت پسند کرتی ہیں اور دوسری جنگِ عظیم میں وہاں پہنچے ہوئے ہندوستانی فوجیوں کو زبردستی اپنے خاوند بننے پر مجبور کرتی ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ وہ گاندھی جی کا بہت بڑا بھگت تھا۔ اُس کے خیال میں گاندھی جی گورو نانک کے اور گورو نانک راجا دشرتھ کے اوتار تھے۔ تبھی گاندھی جی اکثر رام راج کی بات کیا کرتے تھے۔ سارے پریوار میں وہ اکیلا تھا۔

یہ چنڈال چوکڑی تھی۔

(۳)

آخری ہولی کا دن تھا۔ تارو اور سرویا آج صبح سے ہی اپنی گدّی پر تھے۔ بارو پھر کسی سادھو کی خدمت میں لگا ہوا تھا۔ کِسنا ہولی کے تیوہار کی خوشی میں نورجہاں کے پاس تھا۔ تارو کے کپڑے بے داغ تھے۔ اس پر کسی نے رنگ نہیں ڈالا تھا لیکن سرویا سر سے پاؤں تک رنگ میں نہایا ہوا تھا۔

سروپا تارو سے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے وہ گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ لیتے تھے۔ دیکھنے میں تو کوئی بھی رنگ پھینکنے والا گلی میں نہیں تھا لیکن گلی کا اوبڑ کھابڑ فرش رنگ سے تر بتر تھا۔ گھروں کے دروازے بند تھے یا آدھ کھلے۔

کرشن لعل تار بابو کے لڑکے بلّو نے ایک دوسری منزل سے پکار کر کہا "چاچا ؟"

رام سرن لکڑی کے اشال والا بالکل نئے کپڑے پہنے گلی کو خالی دیکھ کر جلدی جلدی نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "دیکھ او ئے بلّو کے بچّے .... بابو رام سرن اپنی ہی گلی کے آدمی ہیں۔ ان پر رنگ بالکل نہیں پھینکنا۔ ہاں سمجھ لو ٹھیک طرح سے ..... بھابی بھیں' ایں ایں ....."

لیکن اس کے ساتھ ہی اوپر سے رنگ کی بوچھاڑ آئی اور رام سرن کئی رنگوں میں سر سے پاؤں تک نہا گیا۔ دراصل اوپر کی چھتوں پر پانچ چھ بچے پچکاریاں لیے کھڑے تھے اور تارو کے منع کرنے کا مطلب ایک طرح کا سگنل تھا۔ سروپا اور تارو نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر سنجیدگی سے کہا "آپ کے رمیش اور مہیش بھی تو اوپر کی چھت پر ہیں، بھابی بھیں .....!"

"ہم نے تو منع ہی کیا تھا' بھابی بھیں .... بھیں' ایں ایں ایں !" اور رام سرن کو گذرتے ہی بن پڑی۔ کیونکہ رنگ کا ایک اور ریلا اوپر سے آرہا تھا۔

وہ پھر باتیں کرنے لگے۔ سروپا کہہ رہا تھا۔ "منشی نجابت علی آج سویرے سویرے ہی اس ندی میں غسل کر کے اپنے حصے کا ثواب اکٹھا کر کے لے گیا ہے۔ مجھے اپنے محلے میں اس کا آنا اچھا نہیں لگتا۔ جب وہ پیٹر گھسیٹا رام کے دروازے سے نکلا تو جی چاہتا تھا کہ سالے کا ٹینٹوا دبا دوں۔ سالا پیٹر اُسے باہر تک چھوڑنے آیا اور پھر جاتے ہوئے بھی حولدار کا بچہ کہہ رہا تھا۔ بخشی جی شام کو آئیں گے .... بخشی جی نئے چھوٹے تھانے دار ہیں۔" اُس نے تارو کو بتایا۔

سروپا پھر بولا "نہ جانے کب یہ ڈائنیں مریں گی تو محلّے کو چین ملے گا۔"

تارو کو شاید بات پسند نہیں آئی۔ اُس نے گفتگو کا رُخ موڑ دیا "کالو نے آج پھر پرمیشوری کو دال گھوٹنے سے پیٹا' اور اگر پارکھ کی ماں بیچ بچاؤ نہ کرتی تو اُسے مار ہی ڈالتا۔ جھگڑا وہی ہے گڑھوالی لڑکوں والا۔ کالو کو لڑکے اچھے لگتے ہیں۔ سنا ہے' پرمیشوری تھانے جانے کی سوچ رہی ہے۔ حالت کچھ ....."

اوپر سے پھر آواز آئی۔" چاچا، اب ؟!!"
دُور سے کوئی ناواقف آدمی آرہا تھا۔

" کون ہے بے ۔ ؟ " تارو نے سروپا سے پوچھا۔ سروپا بھی پہچان نہ سکا، جب وہ قریب آگیا تو تارو نے پکار کر کہا۔" ارے بلّو، لالی، باؤجی پر رنگ نہیں پھینکنا۔ مہمان ہیں اس محلّے کے۔ کپڑے خراب ہوجائیں گے۔"

لیکن اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی رنگ کی بارش شروع ہوگئی۔ جب بابو فراخ دلی سے رنگ کی بوچھاڑوں میں نہا چکا تو تارو نے پھر لڑکوں کو ڈانٹا۔" ارے شیطانو! تم نے رنگ ہی دیا نا باؤجی کو۔! اب بس بھی کرو۔"

نتیجہ کے طور پر اب اوپر سے مٹی اور کیچڑ کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ بابو بے چارہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ لڑکے ہنستے ہنستے بے دم ہوگئے۔ تارو اور سروپا بھی خوب ہنسے۔

" رام پیاری، رام پیاری ۔" تارو نے پھسپھسا کر کہا۔" اور ساتھ میں سیتا بھی ہے۔"

سیتا کسی دوسرے محلّے کی نئی دائی تھی۔ بیوہ تھی اور ایمان داری سے اپنا پیٹ پالتی تھی۔ اس کے بارے میں آج تک یہ لوگ کوئی غلط بات نہ جان پائے تھے۔ جب وہ تھوڑا قریب آگئیں تو تارو نے پوچھا۔

" موسی! آج سویرے سویرے کون سا قلعہ فتح کرنا ہے تم دونوں کو ؟"

رام پیاری نے ایک نظر اوپر تیار کھڑی بانر سینا کی طرف پھینکی اور پھر شاید سوچا کہ صلح صفائی سے گذرے بغیر چارہ نہیں۔ وہ رُک گئی۔ ٹھہرتے ہوئے اس نے کہا۔" بڑا مشکل کیس آپڑا ہے اوتار۔ سیتا مجھے بلانے آئی تھی۔ بڑی ڈاکٹرنی بھی کوشش کر کے ہار چکی ہے۔ زچہ خطرے میں ہے۔"

" یہ بات ۔ ؟ " سروپا نے اس کی بات جھوٹ سمجھتے ہوئے کہا۔" کس کے گھر ہے کیس موسی ؟"

" حافظ آباد کے کوئی براہمن ہیں۔ نئے نئے آئے ہیں۔" سیتا نے کہا۔

اوپر سے حکم سُننے کے لیے پے در پے آوازیں آرہی تھیں ۔" چاچا، چاچا۔"

" اچھا اچھا، جاؤ موسی۔ تمہارا کام بڑا ضروری ہے۔" یہ کہہ کر تارو نے انھیں بھیج دیا اور

پھر نااُمید کھڑے لڑکوں کو پکار کر کہا۔" لالہ بیلی رام پر کوئی رنگ نہ پھینکے بھائی۔ بیلی رام پچاس پیسوں میں ایک ماچس کی ڈبیا دیتے ہیں!"

اور گذرتے ہوئے لالہ بیلی رام کریانہ فروش جب دُودھ کے گلاس سمیت رنگ سے نہا چکے تو اس نے کہا" لال رنگ کا کیا ریٹ ہے لالہ؟ لڑکوں سے پیسے زیادہ تو نہیں لگائے۔؟"

لالہ بھی ایک ہی کائیاں تھا۔ اس نے جوابی چوٹ کی"تمہارے گھر جب ہر برس زچگی کے لیے میرے ہاں سے گڑ، گھی وغیرہ جاتا ہے، تب تو میں زیادہ پیسے نہیں لگاتا نا۔؟"

تارو کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں، لیکن اس کے پاس ترکی بہ ترکی جواب نہ تھا۔ وہ ذرا دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔ لیکن پھر اس نے جاتے ہوئے فتح مند لالہ کو پکار کر کہا' چھوڑو مذاق کو لالہ۔ چلو ہم نے تم سے معافی مانگ لی۔ ہاں میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ کل شام تمہاری دکان کے سامنے سے گذرا تو وہاں کالے ناگ کے باس کا پتا چلا۔ ناگ نکلوا لینا' لالہ' پانچ دس روپے کوئی زیادہ نہیں ہوتے۔!"

بیلی رام کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ کوئی سخت بات کہنا ہی چاہتا تھا کہ رُک گیا' پھر صبر کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے کہا" کل نکال لینا بھائی اُوتار..... پانچ روپے کیا چیز ہوتے ہیں! اگلے برس پھر تمہارے گھر سے کما لیں گے!" اور وہ چلا گیا۔

تارو کا موڈ کچھ بگڑ گیا' لیکن جلد ہی اُسے دل بہلانے کا سامان پھر ہاتھ آگیا۔ سامنے سے جوگیانہ کیسری کپڑے پہنے ایک سادھو آرہا تھا۔ وہ گھروں کے دروازوں کے سامنے آکر الکھ نرنجن بولتا' اناج اور پیسے بٹورتا ہوا شامت کا مارا اس گلی میں آگیا۔ تارو نے سادھو کا استقبال کرتے ہوئے کہا" آؤ آؤ مہاراج! ادھر چبوترے پر بیٹھو..... کہاں ڈیرہ ہے سنتوں کا۔؟"

سادھو نے ایک بھگت کو سواگت کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "بیٹا ہری دوار میں لکشمن جھولا کے پاس دوارا رام ناتھ ستھان ہے۔ سنت تمہاری نگری میں بھوکے پدھارے ہیں۔ پاؤ بھر گھی، لکڑی اور سیر بھر آٹا مل جائے تو بھوجن بنالیں۔ دَیا ہو جائے کرپا ندھان!"

کرپا ندھان سروپا نے آگے بڑھ کر کہا" سادھو مہاراج سنا ہے اب سرکار

سادھو جن پر ٹیکس لگانے والی ہے۔ کیا آپ کو اس بارے میں کچھ خبر ہے؟" اور ساتھ ہی وہ باچھیں پھیلا کر مسکرانے لگا۔

سادھو نے شرارتی نوجوانوں کو پہچان لیا اور وہ ایک بار الکھ نرنجن کہہ کر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ تارو نے پکار کر کہا "الکھ نرنجن۔ ہردوار کے سادھو مہاراج کی جے! ان پر کوئی رنگ نہ پھینکنے پائے۔" اور اس نے سادھو کا چمٹا چھین کر، اُسے ایڑی لگا کر گرا دیا۔ اوپر سے دھمادھم رنگ، پانی، کیچڑ اور مٹی کی بارش شروع ہوگئی۔ تارو خود پیچھے ہٹ گیا۔ سادھو کا آٹا بکھر گیا۔ پیسوں کی بنڈی کھل گئی اور اچھی خاصی ریزگاری بکھر گئی۔ تارو نے اس کا چمٹا نالی میں گرا دیا تھا۔ لڑکوں کی ٹولی اب چھتوں سے نیچے اُتر کر گلی میں کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے لگی تھی۔

"لوٹے نہ کوئی بھائی۔" تارو نے آنکھ دبا کر لڑکوں سے کہا

لڑکے پل پڑے۔ انھوں نے پیسے لوٹ لیے۔ دیکھتے دیکھتے سادھو کا بھگوا چولا پھٹ گیا۔ اس کی چیخ پکار سن کر عورتیں گھروں سے باہر نکل آئیں اور ایک عورت نے کہا "ہرے رام، ہرے رام۔ دھرتی ماتا پھٹ جا۔!"

"لیٹ جاؤ، لیٹ جاؤ۔ بھونچال بھونچال!" تارو نے نعرہ لگایا اور خود دم اکڑوں بیٹھ گیا۔ کچھ عورتیں واقعی بیٹھ گئیں اور باقی حیرانی سے اِدھر اُدھر بھونچال کے آثار ڈھونڈھنے میں لگ گئیں، لیکن تارو کو مسکراتے پاکر انھوں نے اس پر گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

"مرجائے! محلّے کا کلنک! غنڈہ، نکھٹّو۔!"

"میں کیا جانوں، چاچی!" تارو نے ایک عورت سے کہا "تم نے کہا ہرے رام، ہرے رام، دھرتی ماتا پھٹ جا، تو میں سمجھا، بھونچال آگیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سروپا کو بازو سے پکڑا اور چبوترے پر آکر بیٹھ گیا۔ سادھو اب اٹھ رہا تھا۔ وہی لڑکے اب اس کے پیسے چننے اور اکٹھے کرنے میں اس کی مدد کر رہے تھے۔ وہ اُن دونوں کی طرف دیکھتا رہا، لیکن ڈر کے مارے کچھ نہ کہہ سکا۔

جب سا دھو چلا گیا تو تارو نے لڑکوں سے کہا "بس بھئی اب کھیل ختم۔ اب ہمیں کچھ کام کی باتیں کرنی ہیں۔" اور پھر وہ باتوں میں مشغول ہو گئے۔ لڑکے اب رنگ کی پچکاریاں لیے سرِ عام کھڑے ہو گئے تھے۔

"بارو شام تک وڑے کے نتیجے کے بعد آ جائے گا۔" سروپا نے کہا۔ "کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ اب وڑے کے گھڑے میں بھی بے ایمانی ہونے لگی ہے اور چوں کہ نئے پولیس کپتان نے چھوٹے افسروں کو سختی سے تنبیہہ کی ہے اس لیے وہ بھی چھاپہ مارنے کی سکیم بنا رہے ہیں۔"

تارو نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اور بات سوچ رہا تھا۔ پیٹر گھسیٹا رام اب اپنی عیاشیوں کے لیے رات دن اپنی بہن کو تماش بینوں کے ساتھ بھیج دیتا ہے۔ سالا کوئی لولا لنگڑا بھی تو نہیں کہ خود کچھ نہ کما سکے۔ اور سنا ہے، وہ بیمار ہے۔ کسی نے کہا تھا کہ اُسے ٹی بی کی پہلی سٹیج ہے۔"

سروپا منہ پھٹ تھا، فوراً بول اُٹھا۔ "تو کیا ہوا، ایک مرے گی، دوسری اس کی جگہ لے لے گی۔ چھوٹی کی عمر بھی اب اس قابل ہوتی جا رہی ہے کہ کوئی اس کی نتھ اُتارنے کو دو تین سو روپے دے دے۔!"

اسی وقت انھیں سامنے سے منشی نجابت علی آتا دکھائی دیا۔ "ارے بھیّا، یہ بُلبلیا پھر یہاں کیوں؟" تارو نے چونک کر کہا۔

جب وہ اُن کے پاس سے گذرنے لگا تو انھوں نے نظریں نیچی کر لیں۔ حولدار بڑے رعب سے اُن کے پاس سے چلتا ہوا پیٹر گھسیٹا رام کا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر چلا گیا۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ گلی میں کھڑے لڑکوں کو بھی جیسے سانپ سونگھ گیا۔ تارو کا رنگ جلدی جلدی بدلنے لگا۔ وہ منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت پیٹر کے گھر سے چیختی ہوئی آواز آئی "نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔!" ڈولی چیخ رہی تھی۔ اور کھٹ کھٹ کی آوازوں سے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اُسے مار پڑ رہی ہو۔ تارو ایک بار چبوترے سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے نالی پر منہ نیچا کر کے بڑے زور سے قے کرنے کی کوشش کی۔ اس نے زور لگایا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا، لیکن اُس کے منہ سے مواد نہ نکلا۔

سروپا اُسے سنبھالنے لگا۔ اس بیچ میں پیٹر گھسیٹا رام کا دروازہ کھلا اور اس میں سے

پہلے منشی باہر نکلا۔ اس کے پیچھے ڈولی تھی۔ اس کا چہرہ جلدی جلدی ڈھلا دیا گیا تھا۔ وہ اب بھی سسک رہی تھی۔ دونوں گلی پار کرنے لگے۔ ڈولی نے بڑی عجیب سی زخمی پھڑپھڑاتی ہوئی نظروں سے تارو کی طرف دیکھا، جو اب بھی بے سُدھ بار بار قے کرنے کی کوشش میں بے حال ہوا جا رہا تھا۔

تارو جب ذرا ہوش میں آیا تو اس نے سروپا کے ساتھ بڑی سنجیدگی سے رُک رُک کر رازدارانہ لہجے میں کچھ باتیں کیں اور اُسے دھکیل کر اُٹھا دیا۔ "تم کِسنا اور بارو سے ملو اور شام تک واپس یہاں..... آج رنگ بھنگ وغیرہ نہیں..... سمجھے؟" یہ کہہ کر وہ خود بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ سب سے پہلے لالہ بیلی رام کے گھر گیا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور لالہ کے باہر نکلنے پر کہنے لگا — "لالہ ناگ ابھی نکلوا لو۔ مجھے پانچ روپے کی اشد ضرورت ہے۔"

"لالہ بیلی رام نے کہا۔ "تم پانچ روپے بے شک ابھی لے جاؤ۔ ناگ کل نکال لینا اتنی بھی کیا جلدی ہے؟"

"نہیں لالہ، مجھے روپوں سے بھی زیادہ ناگ کی ضرورت ہے۔ تم اُٹھ کر میرے ساتھ چلو اور دُکان کا تالا کھولو۔ میں ناگ کو باہر ہی بُلا لوں گا۔ لیکن سڑک پر بین بجانے یا منتر پڑھنے سے خواہ مخواہ تماشا بن جائے گا۔"

لالہ حیران رہ گیا۔ اس نے ساتھ جا کر دکان کا تالا کھولا۔ تارو نے ڈبے سے بین نکالا اور بجانا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک پھنیر، سانپ اس کے پاس آگیا۔ اس نے اُسے سر سے پکڑ کر اپنی آستین میں چھپا لیا اور پانچ روپے وصول کرتے ہی یہ جا، وہ جا.....

اس دن تارو نے شام تک شہر کے مختلف محلّوں سے لگ بھگ دو درجن سانپ نکالے اور ساٹھ روپے کے قریب رقم کمائی۔ جب شام کو وہ اپنی گدّی پر واپس آیا تو اُس کی آستین میں صرف ایک کالا پھنیر سانپ تھا۔ تارو کا اپنا رنگ کالا ہو رہا تھا اور چہرے پر جیسے کسی نے خون کی آمیزش والی سیاہی پوت دی تھی۔ سروپا وہاں نہیں تھا۔ البتہ بارو اور کِسنا کھڑے شہر کی تازہ بہ تازہ خبروں پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ کِسنا کہہ رہا تھا۔

"افیم کے ٹھیکے کی نیلامی ایک لاکھ بائیس ہزار میں ہوئی اور بارہ ہزار افسر نے رشوت لی۔

اب افیم میں ضرور ملاوٹ شروع ہو جائے گی۔ شکر ہے رب کا کہ ہم چاروں میں سے افیم کی لت کسی کو بھی نہیں پڑی۔"

تارو پہنچا تو کسنا نے کہا "بھیا، سنا تو نے؟ دڑہ بند ہو گیا ہے۔ آج چھاپہ پڑا اور پولیس والے پندرہ آدمی پکڑ لے گئے۔ اپنا بارو، تو شکر ہے، وہاں تھا ہی نہیں، لیکن اس کا نام ضرور ہے، دڑے والوں کی چوپڑی میں!"

"تو پھر؟" بارو نے پوچھا۔

"ارے تو فکر کیوں کرتا ہے؟" کسنا نے ہنستے ہنستے کہا۔ "جب تک کسنا کا دم میں دم ہے، تم لوگ موج اڑاؤ۔ دو سو بخشی صاحب کو دے آیا ہوں۔ تم خطرے سے باہر ہو۔!"

ہولی کا شور وغل اب ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ گلی کے بیچوں بیچ رنگ سے لتھڑا ہوا سادھو کا آٹا اب تک بکھرا پڑا تھا۔ بارو کے کپڑے بھی رنگ سے گیلے تھے۔

تارو نے پرمعنی نظروں سے پیٹر گھسیٹا رام کے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا، "میرا کام؟"

کسنا نے نظریں جھکائے ہوئے ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چھوٹے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ "تین سو کے لگ بھگ ہیں!" اُس نے کہا۔

تارو نے روپے جیب میں رکھتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا۔ کسنا کا ہاتھ دبایا اور چلنے کو ہی تھا کہ گلی کے سرے سے منشی نجابت علی آتا ہوا دکھائی دیا۔ منشی کے ساتھ ایک اونچے اور لمبے طرے والا ایک اور اجنبی بھی تھا۔ سب جہاں کھڑے تھے وہیں سن ہو کر رہ گئے۔ وہ دونوں اکڑ کر چلتے ہوئے اُن کے پاس سے گذر گئے۔

گلی میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسی خاموشی جو اکثر کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ گہری خفیہ اور حاملہ خاموشی۔

وہ دونوں پیٹر گھسیٹا رام کے دروازے پر رک گئے۔ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا جو فوراً ہی کھل گیا۔ وہ دونوں اندر چلے گئے۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔

خاموشی اور گہری ہو گئی۔

یکایک اس خاموشی کو چیرتی ہوئی اندر سے ڈولی کی تیز چیختی ہوئی آواز سنائی دی جیسے فولاد کی پتلی تیز دھار والی تلوار ایک 'شی' کی سی آواز کرتی ہوئی بوجھل فضا کو چیرتی چلی جائے۔ وہ چیخ رہی تھی۔

"میں نہیں جاؤں گی' مار ڈالو، تو بھی نہیں جاؤں گی۔"

آج ایک دن میں یہ تیسری بار تھی۔

تارو نے کسنا کی طرف دیکھا۔ وہ اکڑوں بیٹھ گیا۔ جیسے اچھل کر کسی کا گلا دبوچنا چاہتا ہو۔ اس کے چہرے پر لہو کی آمیزش والی سیاہی اور گہری ہوتی دکھائی دی۔

اندر سے پیٹر گھسیٹا مل کی کڑکتی ہوئی آواز آئی۔ پھر ایک تھپڑ کی تڑاخ سے آواز سنائی دی۔ تھپڑ جو ڈولی کے مرجھائے ہوئے رخساروں پر پڑا تھا۔ تھپڑ جو ایک بہن کو پیشے کے لیے مجبور کرنے کی غرض سے مارا گیا تھا۔

کچھ لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ کسنا نے آگے بڑھ کر اپنے مضبوط ہاتھ تارو کے کندھوں پر رکھ دیے تھے۔ تارو زخمی پرندے کی طرح تڑپ رہا تھا، لیکن کسنا کی پکڑ بڑی مضبوط تھی۔

دروازہ کھلا۔ اس میں سے پہلے منشی باہر نکلا پھر وہ طرے والا اجنبی اور سب سے آخر میں ڈولی۔ لیکن ڈولی کے پیچھے پیچھے پیٹر بھی باہر نکل آیا تھا۔ ڈولی کا منہ جلدی جلدی دھلا دیا گیا تھا۔ پیٹر کے ہونٹوں پر ایک کالی بھدی سی مسکراہٹ تھی۔

جاتے جاتے ڈولی نے پھڑپھڑاتی ہوئی زخمی نگاہوں سے تارو کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ تارو نے جھک کر نالی میں بڑے زور سے قے کی۔

ایک بار، دو بار، تین بار۔۔ ایسے محسوس ہوا جیسے تارو وہ سب کچھ الٹ کر نالی میں پھینک دینا چاہتا ہو جو ایک عرصے سے اس کے پیٹ میں ناجائز اولاد کی طرح کلبلا رہا تھا۔

وہ نڈھال سا ہو گیا۔ عصمت کا لٹا ہوا قافلہ بہت دور تک نکل چکا تھا۔ اس کی آستین والا سانپ بہت بے کلی سے اس کے ارد گرد لپٹ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ کسنا نے اسے چھوڑ دیا۔ تارو کی آنکھوں میں سانپ کی آنکھوں سے بھی زیادہ گہری اور چمکیلی کشش تھی۔

رات محلے میں ہنگامہ بپا ہو گیا۔ پیٹر گھسیٹا رام کو رات کے بارہ بجے کے قریب سانپ

ڈس گیا۔

ڈولی اور لوسی کی چیخوں سے سب جاگ اُٹھے۔ پیٹر نے بےہوش ہونے سے پہلے سانپ کو کچل دیا تھا۔ پہلے لوگ ڈاکٹر کو بلا کر لائے۔ دو تین گھنٹوں میں جب اُس سے کچھ بن نہ پڑا تو کسی کو تارو کا خیال آیا۔ وہ اپنی ڈیوڑھی میں ہی سویا ہوا تھا۔ جب وہ آیا تو ڈولی اور لوسی کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ تارو نے لوبان، دھوپ اگربتی وغیرہ منگوائے۔ آدھ گھنٹہ، ایک گھنٹہ منتر وغیرہ پڑھے۔ آخر میں وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"سانپ مر چکا ہے۔ ناگ دیوتا پوجا قبول نہیں کرتے۔" اُس نے کہا۔

صبح ہوتے ہوتے پیٹر گھسیٹا رام کی موت ہو گئی۔

شہر میں عیسائیوں کی تعداد نہ کے برابر تھی۔ صرف ایک چرچ تھا۔ اس لیے لاش کو دفنانے کا سب خرچ کسنا نے برداشت کیا۔ کسنا نے اپنی اوقات سے بڑھ کر اور دل کھول کر دونوں بہنوں کی مدد کی۔ قبر کو سیمنٹ سے پکا کروایا اور جب دونوں بہنوں نے شہر چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اُس نے روپے پیسے سے بھی اُن کی امداد کی اور ایک رات انھیں ریلوے سٹیشن پر دلّی جانے والی گاڑی پر چڑھا آیا۔ منشی نجابت علی کی تبدیلی دو دنوں میں ہی ہو گئی۔ کہتے ہیں اُس نے کسنا کو کوئی دھمکی دی تھی اور اِس بارے میں نور جہاں کو اپنے وسیلے کام میں لانے پڑے تھے۔

تارو اس واقعے کے دس پندرہ دنوں کے بعد غائب ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ پھر ننگے سادھوؤں کی ٹولی میں شامل ہو گیا ہے اور پنجاب سے دور رشی کیش کی پہاڑیوں میں رہتا ہے۔ لیکن کسنا کو لگ بھگ دو مہینوں کے بعد جو خط ملا وہ دلّی سے پوسٹ کیا گیا تھا۔ وہ تارو اور ڈولی کا سانجھا خط تھا۔ ڈولی نے اُسے کسنا بھائی صاحب کہہ کر خط میں لکھا تھا کہ وہ دونوں بہنیں نرسنگ کا کورس کر رہی ہیں۔ اس کی بیماری کچھ زیادہ نہیں تھی اور اب ٹھیک ہو گئی ہے۔ "وہ" اب موٹر مکینک کا کام کرتے ہیں اور اُن تینوں کو یہ زندگی بہت پسند ہے۔

چنڈال چوکڑی میں ایک رُکن کی کمی ہو گئی تھی۔ لیکن تارو کا چھوٹا بھائی گوردیال عرف دیالو بڑی تیزی سے اُن کی دوستی کا دم بھرنے لگا تھا۔ سانپ پکڑنے کا فن اُسے بھی آتا تھا۔ اور کون جانے اُس کے بعد اُس کے چھ بھائی اور تھے۔!

○○

دروازہ کھلا تو وہ سامنے کھڑا تھا۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں نے ابھی ابھی کوئی بھر بھرا پتھر گیلی زمین سے اٹھایا ہے اور اس کے نیچے سے کوئی لبلبا، مٹ میلا سا نیلا کیڑا اچھل کر میرے سامنے آگیا ہے۔ سچی اُسے پہلی بار دیکھ کر تو مجھے یہی احساس ہوا تھا۔

اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ میں اندر آگئی۔ بڑا سا گول کمرہ تھا جس میں صرف ایک بڑی سی خوشنما میز بچھی تھی۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ ساتھ کے کمرے سے ایک ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک ایک ہی رو میں آ رہی تھی۔

"صاحب؟" میں نے پوچھا۔ اُس نے میری طرف یوں دیکھا۔ جیسے میں نے کوئی انہونی سی بات کہہ دی ہو، لیکن پھر وہ بولا ـــــ "آئیں گے مِش ـــــ" اور اُس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں بیٹھ گئی۔ ہینڈ بیگ میں نے ساتھ والی دوسری کرسی پر رکھ دیا۔ بڑی گرمی تھی۔ میں نے پسینہ پونچھا اور پنکھے کی ہلکی ہلکی ہوا کا مزہ لینے لگی۔ وہ اُلٹے پاؤں چلتا ہوا ساتھ کے کمرے میں چلا گیا۔

میں بیٹھی رہی۔ دس منٹ گذرے، پندرہ اور جب آدھ گھنٹہ گذر گیا اور صاحب نہ آئے تو میرے دل میں کسی چور نے سر اٹھایا۔ شاید یہ آسامی پہلے ہی پُر ہو گئی ہو۔

اُسی وقت وہ پھر کمرے میں آیا۔ اس نے ایک نظر دائیں بائیں کمرے میں دیکھا۔ پھر بڑی میز تک گیا۔ پیپر ویٹ اٹھایا۔ پھر رکھ دیا۔ میز کے نیچے دیکھا۔ کرسی ٹھیک کی۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا الماری تک گیا۔ دروازے کی طرف دیکھتا ہوا واپس آیا...... پھر میز پر پڑی ہوئی فائیل کو کھولا، رکھ دیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

مجھے اُس کی حالت اس بھوکے کُتّے کی سی لگی جو اپنی ہڈی کہیں دفن کر کے جگہ بھول گیا ہو اور بڑی بے چینی سے تلاش کر رہا ہو۔ میرا کچھ کہنے کو ضرور جی چاہا' لیکن میں بیٹھی رہی۔ سوچتی رہی کہ اگر اسامی پہلے ہی پُر ہو چکی ہو تو مجھے لوٹ جانا پڑے گا۔ یوں بھی تو اشتہار دیکھنے کے کئی دن کے بعد آئی ہوں میں! یہاں کوئی لیڈی سکریٹری بھی نظر نہیں آتی۔ کلرک اور ٹائپسٹ ہیں جو ساتھ والے کمرے میں کام کر رہے ہیں۔ سکریٹری یا اسٹینوگرافر ہوتی تو باس کے کمرے میں ہی ہوتی۔ لیکن یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ سوائے اس پلپلے' بیمار اور کمزور چپڑاسی کے۔!

کھٹ کی آواز کے ساتھ میرے خیالوں کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ پیپر ویٹ اس کے ہاتھوں سے فرش پر گر گیا تھا۔ قالین ہونے کی وجہ سے ٹوٹا نہیں تھا۔ جھک کر وہ اُٹھانے لگا تو مجھے کچھ ایسے خیال آیا' جیسے وہ ایک چوپایہ ہو اور مشکل سے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔ سوچا کوئی بات ہی کی جائے۔ لیکن کیا بات کی جائے۔ یہ تو شاید جانوروں سے بھی گیا گذرا ہے۔ کُتّا ہوتا تو آ کر سینڈل سونگھتا' دُم ہلاتا۔ میں اسے پچکارتی' لیکن یہ لجلجا سا کیڑا نما آدمی؟ کیا عمر ہو گی اس کی؟ پچیس برس؟ اٹھارہ برس؟ چالیس برس؟ اندازہ لگانا مشکل تھا۔

یونہی۔ چُپ چاپ بیٹھے رہنے کی وجہ سے عضو عضو درد کرنے لگا تھا۔

"کام کاج کیا ہے یہاں؟" بڑے رازدارانہ، کاروباری انداز سے میں نے اُس سے پوچھا۔

وہ چُپ رہا۔ صرف سر ہلا دیا۔ پیپر ویٹ ایک بار پھر گرا اور وہ جیسے ہی اُسے اُٹھانے کے لیے جھکا' اُس کے کھلے ہونٹوں سے رال ٹپکی' لیکن اُس نے زور لگا کر اُس نیچے گرتی دھار کو مُنہ میں واپس کھینچ لیا۔

مجھے اُبکائی آ گئی۔

بڑا عجیب سا لگا وہ آدمی۔ میں نے اُس کی طرف زیادہ غور سے دیکھا۔ پتلا، بہت پتلا، مُٹ مُیلا، پلپلا سا۔ کمزور اور مدقوق چہرے والا۔ مونچھوں کی جگہ پانچ سات بال۔ داڑھی ندارد، سر کے کچھ بال سفید، کچھ کالے، تیل نہ لگا ہونے کی وجہ سے رُوکھے سوکھے۔ اس کا چہرہ کھُردرا بھی نہیں تھا اور نرم..... خیر، اُسے نرم بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ رنگ کالا اور چندھیائی ہوئی آنکھیں جن کے دونوں کونوں پر گندگی جمی ہوئی تھی۔ تنگ سینہ، عام قد، مَیلا کُرتا اور مَیلا پاجامہ، بس! لیکن اُس کے گلے میں ایک رومال بندھا ہوا تھا۔ اور یہی رومال تھا، جس پر میری پھسلتی ہوئی نظر پل بھر کے لیے رُک گئی۔ رومال ریشمی تھا، صاف تھا، بالکل نیا تھا اور رنگین تھا۔ اس لیے اُس کے جسم پر ایسے لگ رہا تھا، جیسے ڈرائنگ رُوم کی کوئی نادر اور بیش بہا مُورتی اُٹھا کر گندگی کے ڈھیر پر رکھ دی گئی ہو۔

اب تک میں نے کئی دفتروں میں نوکری کی ہے۔ سچ! بڑے بڑے عجیب چپڑاسیوں سے پالا پڑا ہے لیکن کہیں بھی ایسا نمونہ دیکھنے کو نہیں ملا۔ عجیب گدھا ہے یہ بھی! بات کا جواب تک نہیں دیتا۔ ورنہ آپ اگر ایک لیڈی سکریٹری ہوں اور ایک بار ہنس کر چپڑاسی سے بات کر لیں تو عمر بھر کتّے کی طرح دُم ہلاتے ہوئے آپ کے قدموں میں بچھا رہے گا۔ میں نے سوچا اگر اس دفتر میں اس سے پالا پڑا تو بہت مشکل ہوگی۔ بڑی دقّت ہو گی ایک کاغذ اپنے میز سے دوسرے میز تک پہنچانے میں بھی۔ لیکن یہ خواب مجھے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ ابھی تو میں لیڈی سیکریٹری کی آسامی کے لیے ایک اُمیدوار کی حیثیت سے ہی آئی ہوں۔ سچّی۔ میں بھی کئی بار بہت ہی عجیب عجیب باتیں سوچنے لگتی ہوں۔

”کیڑو! کیڑو! ارے اُلّو کے پٹھّے!“ ساتھ والے کمرے سے آواز آئی۔

وہ ٹھٹھکا۔ پیپر ویٹ اُس نے میز پر رکھ دیا اور بھاگ کر دوسرے کمرے میں جا پہنچا۔

”یس سر۔ کلرک سر!..... آیا، سر، ابھی آیا۔“

تو اس کا نام کیڑو ہے۔ کیا مناسبت ہے نام اور شکل میں! کیڑو! مزہ آگیا!! اسے اس نام سے بُلانے میں خوب مزہ آئے گا۔ میں سوچنے لگی۔ میں اس سے کہوں گی۔ ارے کیڑو! اور وہ کیڑے کی طرح رینگتا ہوا میرے پاس آئے گا۔ سر اُٹھا کر میرے چہرے کی طرف دیکھے گا۔

اُس کی رال ٹپکے گی ..... میں کہوں گی یہ فائیل اکاؤنٹ کلرک کو دے آؤ۔ اور وہ بولے گا یش شر، شٹینو شر، شر، شر۔!"

بڑا مزہ آئے گا سچّی! اسے تنگ کرنے میں بڑا مزہ آئے گا۔

ملحقہ کمرے سے ہنسی مذاق کی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں ”ارے کیڑو، اُلّو کے پٹھے، تیرا باپ کاٹھ کا اُلّو تھا کیا؟"

یش شر، کلرک شر۔!"

"حرامی کا پلا۔ جانور کے بچّے۔ تو نے یش شر کے سوائے کچھ سیکھا بھی ہے؟"

"یش شر۔ کلرک شر!"

"بھاگ جاؤ چھوے کی اولاد! اور یہ ڈاک صاحب کی میز پر رکھ دو۔" اس کے ساتھ ہی ایک ٹھوکر کی آواز اور کیڑو کے منہ سے پھسلتی ہوئی ہلکی سی کراہ۔

ٹائپ کی ٹک ٹک پھر شروع ہو گئی۔ کیڑو پھر کمرے میں آیا۔ اس نے کاغذوں کا پلندہ میز پر رکھ دیا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ابھی ایک منٹ پہلے ہی ہوئی بے عزّتی کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہ یوں ہی کیڑا سا لگ رہا تھا۔ مٹ میلا، لجلجا سا، کمزور سا کیڑا۔

"دیکھو!" میں نے کہا "صاحب ابھی نہیں آئے۔ میں اپنا کارڈ چھوڑ جاتی ہوں۔ میں کل پھر آؤں گی!"

اسی وقت باہر کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی داخل ہوا۔

کیڑو اُسے دیکھتے ہی جھک گیا "شاب شر! مش شر۔"

میں کھڑی ہو گئی۔

"سِٹ ڈاؤن پلیز!" باس نے مجھ سے کہا اور پھر اپنی فیلٹ ہیٹ کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کیڑو سے بولا "پنکھا تیز کر دو!"

"یش شر، شاب شر!" لیکن وہ کھڑا رہا۔

"بھاگ جاؤ! یو سِلی گوز!" اس نے گرج کر کہا۔

کیڑو اُلٹے پاؤں چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر پنکھا تیز کر دیا۔

"مس گورڈن !" اس نے کہا۔ اور میرا "جی" سن کر نظریں اُٹھائیں۔ "چار برسوں تک ایمی اینڈ ایمی میں سروس۔ آپ نے وہاں سے چھوڑا کیوں تھا؟"

"مجھے لکھنو جانا پڑا تھا۔ مدر سخت بیمار تھیں، اور مجھے وہاں کافی دن لگ گئے۔"

"اور اب؟"

"مدر کی ڈیتھ ہو گئی ہے!"

میرا افسوس بھرا لہجہ دیکھ کر وہ جیسے چونک سا اٹھے۔

"آپ کام سنبھال لیجیے۔ آپ کی عرضی ملنے پر میں نے ایمی اینڈ ایمی کے ڈائرکٹر سے بات کی تھی۔ نئی سکریٹری رکھ لینے کے باوجود وہ لوگ آپ کے کام سے اس قدر مطمئن تھے کہ انھوں نے آپ کی پرزور سفارش کی..... اے ادھر سن!" انھوں نے کیٹرو کو آواز دی۔

کیٹرو دوڑتا ہوا اندر آیا۔

"ایڈیٹ! مس کو اکاؤنٹینٹ کے پاس لے جاؤ..... ٹمپریری چارج اکاؤنٹینٹ کے پاس ہے۔ آپ اس کے ساتھ جائیے۔!"

"مش شاب ایش ...... اکاؤنٹ شاب!" اس نے کہا۔

میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے حیران دیکھ کر صاحب نے کہا۔ "ایڈیٹ ہے..... آپ سختی سے کام لیں گی تو کرے گا۔"

سچ، کبھی کبھی بہت عجیب سا لگتا تھا۔ باس سامنے بیٹھے ہیں۔ میں اپنی میز پر ہوں۔ اور کوئی نہیں۔ کیٹرو دروازے میں ایک سٹول پر بیٹھا اُونگھ رہا ہے۔ اس کی رال لٹکنے لگتی ہے۔ وہ یکایک زور لگا کر اسے واپس کھینچ لیتا ہے۔ میں مُنہ پھیر لیتی ہوں۔ لیکن اگر کہیں صاحب کی نظر پڑ جاتی ہے تو بس پھر قیامت۔

"کیٹرو۔"

"یش شر! شاب شر!"

"یُو ڈاگ !...... اِدھر آؤ !"

"یس سَر ! شاباش سَر !"

صاحب کا پاؤں اُٹھتا ہے تھوڑا اُوپر اُٹھتا ہے۔ بیٹھے ہوئے ہی وہ ایک بھرپور لات اُس کے کمزور جسم پر مارتے ہیں۔ وہ لڑکھڑا جاتا ہے۔ کئی بار گر بھی جائے تو ایک دو ٹھوکریں اور لگ جاتی ہیں۔

"سِلی گوز !" اپنی تھوک سنبھال کر رکھا کرو !"

"یس سَر ! شاباش سَر !" وہ واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اُس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ درد کے نشان بھی نہیں ہیں۔ وہ ایک پلپلا' پتھریلا بُت ہے۔ پتھر کو درد کا کیا احساس ؟ اور سچ، اتنی بھَر پُور رگِک ! سُنا ہے' باس فٹ بال کے بہت اچھے کھلاڑی رہے ہیں۔

اکثر مجھے اس پر رحم آتا۔ میں جہاں تک ممکن ہوتا اُس سے بات کرتی۔ کسی کام کو کہنے سے پہلے بہت آہستگی سے اور نرمی سے سمجھاتی۔ لیکن وہ سمجھ نہ پاتا تو میں جھنجھلا جاتی' میرا منہ روہانسہ سا ہو جاتا۔

ایسے ہی ایک موقعے پر باس باہر سے آ گئے۔ مجھے ہارا ہوا' ہزیمت خوردہ دیکھ کر انھوں نے پاس آ کر اسے ایک ٹھوکر لگائی۔ "سُوّر ! مِس کہتی ہیں بازار سے یہ لے آؤ !" اور انھوں نے میری لکھی ہوئی چِٹ اسے تھما دی۔ چِٹ پر میں نے پنسل شارپنر لکھ دیا تھا۔ وہ چند منٹوں میں ہی متعلقہ چیز اور باقی کی ریزگاری لے کر آ گیا۔

"مِس گورڈن' پلیز ڈونٹ ویسٹ یور مرسی آن ہِم ! یہ تو گُڈ فار نتھنگ راسکل ہے !" صاحب نے سمجھایا۔

ایک دن میں نے مسٹر سوری سے پوچھا "صاحب اسے نوکری سے نکال کیوں نہیں دیتے مسٹر سوری ؟ اسی تنخواہ پر اس سے کئی اچھے چپڑاسی مل سکتے ہیں۔ ابھی ایڈمن میں ایک چپڑاسی تھا....."

"ٹھیک ہے' مِس گورڈن ..... لیکن باس کی جھڑکیاں' گالیاں اور ٹھوکریں کون سہے گا؟ یہ تو جانور ہے' جو جی چاہے اس کے ساتھ سلوک کر لو۔ ایک بار صاحب نے تجربہ بھی کیا تھا۔ نیا چپڑاسی صرف دو دن رہا' پھر تنخواہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

سچی' میں تو حیران رہ گئی۔ ایک بار میں نے اُس سے پوچھا "کیٹرو تمھیں مارپڑتی تو بُرا نہیں لگتا؟"

"یس مِش، یش سَر۔"

"بُرا نہیں لگتا؟ کیوں؟" میں نے پھر پوچھا۔

"یش مِش....مِش سَر!" اُس نے پھر اسی سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

مجھے نہ معلوم کیوں غصہ آگیا۔ "گیٹ آؤٹ! یُو ایڈیٹ!" میں نے لگ بھگ چیختے ہوئے کہا۔

کوئی فرق نہیں پڑا اُس کے لہجے میں — یش سَر!....مِش سَر.... کہتا ہوا وہ اُلٹے پاؤں چل کر باہر نکل گیا۔

لیکن کچھ لمحوں میں ہی وہ واپس میری میز کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ "مِش شاپ..... یہ شوئی سَر۔"

"کیا ہے؟" میں نے کاغذوں سے سر اُٹھائے بغیر پوچھا۔

اُس نے آگے ہوکر دونوں ہاتھوں سے میرے جوڑے کا ہیئر پن اس نفاست سے میرے جوڑے میں لگا دیا کہ میں ہکّی بکّی رہ گئی۔ میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ لیکن اُس کا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میرا گرا ہوا رومال اُٹھا کر دیتے ہوئے ایمی اینڈ ایمی کے چپڑاسی کے پسینے چھوٹنے لگے تھے۔ میں کچھ خوش ہوئی، کچھ حیران ہوئی اور میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپایا۔ "تھینک یو کیٹرو!" میں نے کہا۔

"یش مِش۔ یش سَر؟" مطلب یہ کہ کوئی اور خدمت مِس؟ یا کیا میں اب جا سکتا ہوں؟ یا کیا میں نے جوڑے میں شوئی لگا کر کوئی زیادتی تو نہیں کی؟ مطلب کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ میں نے پرس کھول کر پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اُسے تھما دیا۔

"مِش سَر؟" مطلب کیا لے کے آنا ہے؟

"کچھ نہیں۔ تم رکھ لو، تمہارا انعام ہے۔"

نوٹ اُس نے چپ چاپ جیب میں رکھ لیا، لیکن میں نے اُس کے چہرے پر جذبات کا کوئی مدّوجزر نہیں دیکھا۔ معمول کی طرح اُس کا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا۔ وہ سٹول پر بیٹھا ریوڑیاں کھا رہا تھا۔ شاید اُس نے پانچ روپے کا بیشتر حصّہ اسی پر خرچ کر دیا تھا۔

اکثر یوں ہوا کہ باس دفتر میں نہیں ہیں۔ مجھے اپنا چہرہ ٹھیک کرنے کی ضرورت پڑی ہے۔ ڈریسنگ رُوم نہ ہونے کی وجہ سے مجھے یہ کام اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہی کرنا پڑا ہے۔ میں نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا ہے۔ دستی آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا ہے۔ بال سنوارے ہیں۔ لپ سٹک لگائی ہے۔ اگر اچٹتی ہوئی میری نظر اس کی طرف اُٹھ جاتی ہے تو میں دیکھتی ہوں کہ اُس کا چہرہ جذبات سے قطعاً خالی ہے لیکن وہ ٹکر ٹکر مجھے دیکھتا جا رہا ہے۔ ایک دن ہونٹوں پر سُرخی کی پتلی سی تہہ جماتے ہوئے میں نے بڑی نرمی سے اُسے پکارا۔

"کیرٹو۔"

"یش مش شاب..... میم شاب"

میں نے غور کیا۔ اُس نے مجھے میم شاب کہہ کر پکارا تھا۔

"کچھ نہیں، بیٹھ جاؤ۔"

"یش، میم شاب!"

دفتر میں ہم صرف تین تھے۔ بوڑھا اکاؤنٹینٹ سہگل جو باس کے والد کے وقت کا پرانا نوکر تھا۔ کلرک سُوری اور میں۔ یہ باس کا ذاتی دفتر تھا۔ شہر کے دوسرے حصّے میں کمپنی کا بہت بڑا دفتر تھا جس میں درجنوں کلرک تھے۔ کمپنی کا سارا کام وہیں ہوتا تھا۔ باس صرف تھوڑی دیر کے لیے ہی اس دفتر میں آتے۔ اُن کے وقت کا بیشتر حصّہ بڑے دفتر میں یا گھر پر ہی گذرتا تھا۔ اُن کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ صرف ایک لڑکا تھا' جو امریکہ میں تعلیم پا رہا تھا۔

کیرٹو اس دفتر میں کب آیا، کیوں آیا اور کیسے آیا۔ اس کا پتہ مجھے نہ چل سکا۔ سُوری کو بھی اس کا علم نہیں تھا۔ وہ پہلے بڑے دفتر میں آیا تھا اور گذشتہ دو برسوں سے ہی اس ذاتی آفس میں تبدیل ہو کر آیا تھا۔ البتہ سہگل کو اُس بات کا بخوبی علم تھا۔ اس سلسلے میں ایک بار میری بات چیت اس سے ہوئی۔ مجھے کیرٹو سے کوئی خاص ہمدردی تو نہیں تھی۔ سچی' اُس پر رحم بہت آتا تھا۔

سہگل نے کہا "مس گورڈن عجیب آدمی ہے یہ بھی! باس اسے نہ معلوم کہاں سے پکڑ لائے تھے۔ نہ اس کی ماں ہے نہ باپ۔ کوئی رشتہ دار تک نہیں۔ جب پہلی بار یہ یہاں آیا تو مجھے بڑی مشکل

محسوس ہوئی۔ کوئی بات سمجھانی ہوتی تو گھنٹوں مغز پچی کرنی پڑتی۔ ایک دن مجھے اس سے دو تین بھاری رجسٹر اٹھوا کر لے جانے تھے، دو تین بار اس نے اٹھائے، پھر پٹخ دیے۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے دو چار لاتیں جمادیں تو گدھے کی طرح چپ چاپ کام کرنے لگا...... اس دن سے اس سے کام لینے کا ایک گر ہاتھ آگیا ہے۔ دیکھیے، میں آپ کو دکھاؤں..... اِدھر آبے، اُلو کے چرخے۔" اس نے آواز دی۔ "او کتے کے پلّے ادھر آ!"

"یس سر...... اکاؤنٹ سر!" وہ بھاگتا بھاگتا آ پہنچا۔

سہگل کی بوڑھی آنکھیں شیطانی روشنی سے چمک اٹھیں۔ مجھے یوں لگا، جیسے کوئی بوڑھا غدار فرشتہ جنت کی سب سے نچلی سیڑھی سے جھک کر کسی دوزخی سے رشوت لینے لگا ہو۔ اس نے ایک آنکھ بند کر لی اور پھر لکیریں کھینچنے والا موٹا لکڑی کا رول لے کر کیڑو کی ٹانگوں پر پھینک مارا۔

"یس سر...... اکاؤنٹ سر!" درد سے بلبلا کر کیڑو ایک بار بیٹھ گیا۔ پھر اس نے رول اٹھا کر بڑے سلیقے سے میز پر رکھ دیا اور کونے میں پڑے تینوں موٹے رجسٹر اٹھا لیے۔

"یس سر...... اکاؤنٹ سر!" مطلب یہ کہ انھیں کہاں لے جانا ہے؟

شوری اور سہگل زور زور سے ہنسنے لگے۔ مجھے متلی سی آگئی۔ سچی، مجھے وہ بہت بُرے لگے۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی اور بیٹھ کر گھنٹوں روتی رہی۔ شاید ماں کی وفات کے بعد میں پہلی بار اتنا کھل کر روئی تھی۔

پھر ایک دن سہگل نے اسے اپنے سوجھے ہوئے پاؤں کی مالش کرنے کے لیے کہا اور اس خدمت کے دوران میں اسے کئی ٹھوکریں ماریں اور ایک دن پانی کا گلاس ہاتھ سے گر جانے پر باس نے بھی ٹھوکروں سے اس کی تواضع کی۔

شوری نے ایک بار اسے گھٹنوں کے بل اکڑوں کھڑا کر کے کئی بھاری رجسٹر اس کی کمر پر رکھ دیے اور گدھے کی طرح ہانک ہانک کر آدھ گھنٹہ دفتر میں پھراتا رہا اور سہگل زور زور سے ہنستا رہا۔

اتنی باتیں ہوئیں۔ سچی، اتنی باتیں ہوئیں کہ اگر کسی اور کے ساتھ ہوئی ہوتیں تو وہ کب کا نوکری چھوڑ کر بھاگ گیا ہوتا یا باغی ہو جاتا اور موقع ملتے ہی ایک دو کا خون کر ڈالتا، لیکن مجال

ہے جو کیڑو کے ہونٹوں سے شکایت کا ایک لفظ بھی نکلا ہو۔ ماتھے پر بل بھی آیا ہو۔ وہ مشینی کل کی طرح
چُپ چاپ اپنا کام کرتا رہا۔ گالیاں سہہ لیتا، مار برداشت کر لیتا اور پھر دُکھتے ہوئے اعضا کے
ساتھ کام میں لگ جاتا۔ کئی بار میں سوچتی کہ سچ! عجیب ہے یہ قوّت برداشت بھی کہ اتنے ظلم وستم
سہتے ہوئے بھی اس شخص کے مُنہ سے کبھی گلہ، کبھی شکایت کا ایک حرف تک نہیں نکلا۔ کبھی اس
نے بہتر زندگی کے لیے جدّوجہد نہیں کی۔ کبھی اس نے بغاوت کا عَلَم بلند نہیں کیا۔ کبھی اس نے ہاتھ
جوڑ کر یہ عرض بھی نہیں کی کہ اُس کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کیا جائے!

کئی بار مجھے اس کے احساس سے کورے، بے حس وطیرے پر غصہ آتا۔ دن بہ دن اُس
کے کمزور جسم پر دُکھوں کا بوجھ اور بھاری ہوتا جا رہا ہے اور وہ ہے کہ اُسے کوئی فکر نہیں، کوئی خیال
تک نہیں، کچھ احساس تک نہیں کہ وہ آدمی ہے، اشرف المخلوقات ہے، گدھا نہیں ہے۔

تنخواہ ملتے ہی وہ دو سو روپے کے نوٹ جیب میں ڈالتا اور ریڈی میڈ کپڑوں کی کسی
دُکان سے نیا کرتا اور پاجامہ لے آتا۔ پرانا لباس جو صرف ایک ماہ پرانا ہوتا، پھینک دیتا۔
مہینے بھر کے کھانے کے روپے سامنے ڈھابے پر دے دیتا اور جو کچھ بچ رہتا اس سے روزانہ
نت نئے ریشمی رومال خریدتا رہتا۔ ایک ریشمی رومال ہر وقت اُس کے گلے میں رہتا تھا۔ میں نے
کبھی اُسے نہا کر آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ چوتھے پانچویں مہینے بال ضرور کٹوا آتا تھا۔ روپے پیسے
کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ تبھی تو اتنی کم تنخواہ میں گذارہ کر لیتا تھا لیکن اپنی عزّت کا خیال..... اپنے
انسان ہونے کا احساس!

جانور، سچ، بالکل جانور تھا وہ!

پھر کچھ ایسا ہوا کہ دن بہ دن اُس پر سختیاں بڑھتی گئیں۔ باس کو کاروبار میں گھاٹا
پڑنے لگا۔ اُن کے لڑکے نے امریکہ میں چُپ چاپ ان کی اجازت کے بغیر شادی کر لی اور وہیں
بس گیا۔ سہگل کی بیٹی کو ٹی بی ہو گیا اور وہ بھی ہر وقت چڑ چڑا رہنے لگا۔ سوری کو اس
کی بیوی دھوکا دے گئی اور وہ بھی غصیلا ہو گیا۔ ان سب باتوں کو بھگتنا پڑا تو بے چارے کیڑو کو۔
سارا دن اس پر مار پڑتی۔ دن بھر اُسے گالیاں سُننے کو ملتیں۔

"کیڑو، کتّے کے پلّے!"

"یشں شر، اکاؤنٹ شر۔"

"تیری ماں نے تجھے گندگی کے ڈھیر سے اُٹھایا تھا۔؟"

"یشں شر..... کلرک شر....."

"گیٹ آؤٹ۔ یو سِلی گوز!" ایک ٹھوکر، ایک گالی، ایک کراہ۔

"یش شر۔ باش شر۔!"

"یشں شر۔ شاب شر!"

گالی، تھپڑ، ٹھوکر، گھِگھیانا — "یش شر، شاپ شر۔ یش شر اکاؤنٹ شر۔ یشں شر، کلرک شر۔"

اس کی یہ حالت دیکھتی تو دل بہت کڑھتا۔ کئی بار جی چاہا کہ خود نوکری چھوڑ کر چلی جاؤں لیکن جاؤں کہاں؟ نوکری ملنا اتنا آسان ہوتا تو چلی نہ جاتی۔ ایمی اینڈ ایمی میں تھی تو لیڈرز کے سامنے کوئی گالی تھپڑ تو کیا، بات تک اونچی آواز میں نہیں کر سکتا تھا۔ اور یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔

کیٹرو کا اصل نام مجھے پتہ نہ چل سکا۔ سہگل اور سوری کو بھی اس کا اصل نام پتہ نہ تھا۔ تنخواہ کے واؤچر پر وہ کیٹرو کے نام کے سامنے ہی رسیدی ٹکٹ پر انگوٹھا لگا دیا کرتا تھا۔ ایک دن میرے کہنے پر سہگل نے اس سے اُس کا اصلی نام پوچھا۔

"کوڑو رام!" اُس نے بے دھڑک ہو کر بتایا۔

سب چونک اُٹھے۔ کسی کو یہ خیال نہ تھا کہ وہ یوں بے دھڑک ہو کر آگے سے جواب دے سکتا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اُس دن شام کو چھٹی سے پہلے میں نے اُسے بلایا۔

"کوڑو رام۔!"

وہ ٹکر ٹکر میری طرف دیکھتا رہا، لیکن میرے قریب نہ آیا۔

میں نے دوبارہ بلایا۔ "کوڑو رام ذرا اِدھر تو آنا۔"

وہ پھر بھی چپ چاپ کھڑا رہا۔

سوری شاید میرے پیچھے کھڑا تھا اور میرا تحیر بہ دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر اپنا امپریشن جتانے کے لیے وہ آگے بڑھا میرے روکتے روکتے اُس نے دو چار زور کی ٹھوکریں اُسے لگا دیں "کیڑو کے بچے، حرام زادے، سُنتا نہیں، مس صاحبہ تجھے بلا رہی ہیں۔"

اُس کے مُنہ سے خون بہنے لگا۔ وہ چُپ چاپ اُٹھ کھڑا ہوا — "یش شر، مش شر!" اُس نے مجھے کہا، لیکن میں نے دیکھا اُس کے چہرے پر کچھ جذبات اُبھر رہے تھے۔ غیر یقینی اور ڈر اور نفرت کے مِلے جُلے جذبات۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔

ایک دن ایک نیا واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ میں کام کر رہی تھی۔ وہ میرے قریب آیا۔ اس نے آہستہ سے کہا — "مش شاب، مش شاب۔"

"کیا ہے؟" میں نے کاغذوں سے سر اُٹھائے بغیر پوچھا۔

وہ اپنے ہاتھ دکھا رہا تھا۔

میں دَنگ رہ گئی۔ اُس کے ناخنوں پر کیوٹکس لگی تھی۔ میں نے دیکھا، میرا ہینڈ بیگ فرش پر کھلا پڑا تھا اور اس میں سے میری کیوٹکس کی شیشی غائب تھی۔ مجھے بہت غصہ آیا، لیکن میں پی گئی۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ "اچھے ہیں۔!"

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ میں اس واقعے کو بھول سی گئی۔ کیڑو پر ظلم بڑھتے جا رہے تھے۔ باس دفتر میں آتے تو دو چار لاتیں جما دیتے۔ جتنی دیر رہتے بے چارے کیڑو کی شامت آتی رہتی۔ جب واپس جاتے تو مرمت کر کے جاتے۔ سوری اور سہگل بھی وقت بے وقت کسر نکالتے رہتے، لیکن میں اب ایک خاص بات نوٹ کرتی۔ یہ گالیاں، مار اور بے عزتی سہتے ہوئے اُس کے چہرے پر درد کا احساس ہوتا۔ وہ محسوس کرنے لگ گیا تھا کہ اُس کے ساتھ غلط سلوک ہو رہا ہے۔ یہ انقلاب بہت آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ کیوں آ رہا تھا اسے کسی خاص واقعے نے شروع کیا تھا، یہ تو میں نہیں کہہ سکتی، لیکن مجھے محسوس ہوا کہ اکائی اپنی شخصی سالمیت کو پہچان رہی ہے۔ اسے یقیناً اپنی قابلِ رحم حالت کا اندازہ ہونے لگا تھا۔

ایک دن میں بیٹھی تھی۔ باہر سڑک پر ایک ٹانگے میں لگے لاؤڈ سپیکر سے ایک

اعلان سن رہی تھی ۔" ہمیں لوگوں کی امداد چاہیئے.... ہم ٹرانسپورٹ کمپنی کے بھوک ہڑتالی ہیں...... ہمیں بونس دو...... ورکرز یونٹی، زندہ باد! ورکرز یونٹی زندہ باد..... آخر ہم انسان ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کا پیٹ پالنا پڑتا ہے، ہماری تنخواہیں بڑھاؤ۔ ورکرز یونٹی، زندہ باد!" یونہی میری نظر کیٹرو کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ جیسے سب کچھ سمجھ رہا ہو۔ اُس کے چہرے پر رنگ جلدی جلدی بدل رہے تھے۔

ایک دن شام کو میں نے اُسے بازار میں دیکھا۔ وہ کسی آدمی کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ اُس آدمی کو بغور دیکھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ اخبار بیچنے والا وہی ہاکر ہے جو ہمارے دفتر میں روزانہ اخبار دے کر جایا کرتا ہے۔ میں نے سوچا کیٹرو کو باس نے شاید کسی کام سے بھیجا ہو گا۔ مجھے بازار میں سائیکل پر جاتے دیکھ کر اُس نے مُنہ پھیر لیا۔ اس کے چہرے پر نفرت کے آثار تھے، جیسے وہ مجھے اپنے دشمنوں میں شمار کرتا ہو۔ تب حقیقی طور پر مجھے خوشی ہوئی ۔

کچھ دن اور گذر گئے۔

باس ایک دوپہر کو آئے تو اُن کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ میں نے ڈاک سامنے رکھی۔ اُس میں ایک کیبل اُن کے لڑکے کی تھی، جس میں اس نے ایک ہزار ڈالر منگوائے تھے۔ باس کا موڈ اور بگڑ گیا۔ وہ ہاتھ سے ہی ایک ایروگرام چھٹی لکھنے لگے۔ لکھتے لکھتے اُن کے فاؤنٹین پین کی سیاہی ختم ہو گئی۔

"دوات ۔" انھوں نے چلّا کر کہا۔

میرے پاس کوئی دوات نہیں تھی۔ کیٹرو کو میں نے اشارے سے کہا کہ ساتھ والے کمرے سے لے آئے لیکن وہ نہ سمجھ سکا۔

"ایڈیٹ! یُو پگ ہیڈڈ! اکاؤنٹینٹ سے دوات لے آؤ۔"

"یس سَر! باس سَر، دوات...... اکاؤنٹ!" وہ گردان کرتا ہوا ساتھ کے کمرے میں گیا اور دوات لے آیا۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے یا باس کا ہی قصور تھا۔ میں نے دیکھا کہ بھری ہوئی دوات اُن کے سوٹ پر اُلٹ گئی۔ غصہ اُبل پڑا۔ باس نے زور سے ایک لات جمائی۔ وہ پٹخنیاں کھاتا ہوا دیوار کے ساتھ جا لگا۔ میں سُن رہ گئی۔ باس نے اس پر بھی اکتفا

نہ کی۔ وہاں جاکر بھی اُسے کئی ٹھوکریں لگائیں ۔" ایڈیٹ، ہِلّی، راسکل۔!"

یَں دَم سادھے کھڑی رہی۔ کیڑو کے مُنہ سے خون بہنے لگا۔ میں نے سمجھا کیڑو مر گیا۔ لیکن کیڑو مرا نہیں۔ اپنی عادت کے بالکل اُلٹ۔ اُس نے مُنہ سے 'شاب' یا 'بُش' کچھ بھی نہ کہا۔ آہستہ آہستہ اُٹھا۔ پاس آیا۔ جہاں باس کھڑے اپنا سوٹ جھاڑ رہے تھے۔ پھر اُس نے ایک بڑی عجیب بات کی۔ سچّی بڑی عجیب بات کی۔ وہ نیچے جُھکا۔ میں سمجھی وہ باس کے پاؤں چُھو رہا ہے، لیکن اُس نے خالی دوات اُٹھائی اور بڑی پُھرتی سے باس کے مُنہ پر دے ماری۔

جیسے صدیوں کا خوابیدہ آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑے۔ وہ زور سے جانوروں کی طرح دہاڑا اور پھر بھاگ گیا۔

جب میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ بھاگ چکا تھا۔ باس کُرسی پر بیٹھا اپنا گال سہلا رہا تھا۔ ہم تینوں اُس کے ارد گرد کھڑے تھے۔ کسی کو بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ کئی دِنوں کے بعد میں نے اُسے بازار میں دیکھا۔ اُس نے اخباروں کا بنڈل اُٹھایا ہوا تھا اور وہ چلّا چلّا کر اخبار بیچ رہا تھا۔ "پڑھیے روزانہ پرتاپ، ملاپ، ہند سماچار، ٹربیون، انڈین ایکسپریس...... اخبار، ہندی اردو انگریزی اخبار!"

اس نے مجھے سائیکل پر دیکھا تو پہچان گیا۔ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹھکا۔ پھر آگے بڑھ آیا۔

"مِس شاب، میں اِدھر اخبار بیچنے کا کام......"

"کیڑو!" میرے مُنہ سے حیرت، خوشی اور پیار کے مِلے جُلے جذبات سے بھرا ہوا اُس کا نام نکلا۔

"نہیں، کوڑو رام، مِس شاب!" اُس نے تصحیح کی۔

○○

لال بادشاہ

اُس نے جھاڑو دیوار کے سہارے کھڑی کر دی۔ پہلے ٹارزن کی طرح سینے میں ہوا روک کر اپنے جواں مرد ہونے کا ثبوت دیا۔ پھر ایک جوکر فلم اسٹار کی طرح پتلون کے پائینچے اوپر چڑھا کر ناچ کے ایک دو سٹیپ لیے اور پھر ایک دوسرے جذباتی رول کرنے والے اداکار کی طرح بالوں کے گچھے کو ماتھے پر پھینک کر بڑی سنجیدہ اور درد بھری آواز میں ایک گانے کے دو بول کہے۔ ان تینوں ہستیوں کی کامیاب نقل کر چکنے کے بعد اُس نے جھاڑو پھر دیوار کے پاس سے اُٹھالی۔

تبھی چرن سنگھ نے پکارا — "بھوندو!"

وہ نہیں بولا۔

چرن سنگھ نے پھر پکارا — "بھوندو —!"

"اوں ہنھ!" اُس نے جذباتی فلمی ستارے کی طرح ماتھے پر بل ڈال کر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔

چرن سنگھ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُس نے فائیلوں کے ڈھیر سے اپنی نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ "لال بادشاہ!"

اُس کی ہنسی بکھر گئی۔ "ہاں یوں کہو سردار جی! اب بولو، کیا حکم ہے اس ناچیز غلام کے

لیے ؟" اُس نے پوچھا۔

چرن سنگھ نے اُسی طرح مسکراتے ہوئے کہا — "حکم کیا لال بادشاہ، بس عرض ہے تمہارے حضور ہیں۔ کوئلے ختم ہیں اور تمھاری بی بی جی کہہ رہی تھیں کہ کوئلے کے ڈپو والا لال بادشاہ کا واقف ہے۔!"

"سو تو ہے ہی سردار جی!" بھوندو جمعدار عرف لال بادشاہ۔ عمر اٹھارہ برس نے خوشامد کی ہُوا سے پھول کر کُپّا ہوتے ہوئے کہا۔" وہ تو میرا جگری دوست ہے۔"

"تو پھر لادو نا بھائی لال بادشاہ! ویسے تو بڑی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے اور سارا سارا دن قطار میں کھڑے ہونے پر بھی باری نہیں آتی، لیکن اگر تمھاری جان پہچان ہے تو کیا کہنے۔ بی بی جی سے بوری اور روپے لے جاؤ اور دو من کوئلے لادو ..... لال بادشاہ!" اُس نے رُک کر پھر وہی طلسمی لفظ جوڑتے ہوئے کہا۔

"اوہ بہت اچھا! ابھی لایا..... یوں چٹکیوں میں لایا.....!" اُس نے جھاڑو ایک بار اُچھال کر رائفل کی طرح کندھے پر رکھی۔ لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے ایک اور فلمی ستارے کی کامیاب نقل کی اور خالصہ ٹریڈرز کے گودام سے باہر نکل آیا۔

لال بادشاہ کے باہر نکلتے ہی گانٹھیں کھولتے ہوئے پربھو سنگھ نے چرن سنگھ سے کہا۔ "سردار جی، کمال کا چھوکرا ہے۔ لال بادشاہ کہہ کر پکارو اور جو کام مرضی ہو کروا لو۔ اب اب یہ دو تین گھنٹے وہاں کپڑے پھڑوائے گا، لیکن یقین رکھیے کوئلے ضرور لے آئے گا۔ اسے لال بادشاہ کے نام کی لاج جو رکھنی ہے۔"

چرن سنگھ نے اپنی سفید ہوتی ہوئی مونچھوں کو کھجلایا اور کچھ کہے بغیر ہی ہونٹوں میں مسکرایا۔ اُسے پربھو سنگھ کی رائے پر رائے زنی کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

خالصہ ٹریڈرز کے پانچ بڑے گوداموں کا خاکروب اپنے اصلی نام سے بلائے جانے پر کبھی نہ بولتا۔ اُسے اب خود بھی یہ یاد نہیں رہا تھا کہ لال بادشاہ کے نام کے پیچھے کیا کہانی تھی اور

اب تو ایک مدت ہی ہوگئی تھی اُسے اس نام کو اپنائے ہوئے۔ گوداموں کے دوسرے ورکر، پربھو سنگھ، کالا سنگھ، مہتاب سنگھ۔ سبھی اس نام سے اتنے واقف ہو گئے تھے کہ انھیں بھی کبھی کبھی اُس کے اصلی نام کا خیال نہیں رہتا تھا۔ چرن سنگھ پھر بھی کبھی کبھی اُسے چھیڑنے کے لیے بھوندو کہہ کر بلاتا۔ ایسے موقعوں پر بھوندو کا ردِ عمل دیکھنے کے قابل ہوتا۔ یا تو وہ بالکل ہی چپ رہتا، جب تک کہ چرن سنگھ اپنی غلطی کا احساس کر کے اُسے دوبارہ لال بادشاہ کے نام سے نہ پکارتا، یا زور زور سے پاؤں پٹک کر باہر نکل جاتا۔ پھر چرن سنگھ کو خود اٹھ کر اُسے منانا پڑتا۔ ایک بار کے بدلے میں دس بار اُسے لال بادشاہ کہنا پڑتا۔ اس کے بغیر ان کا گذارا بہت مشکل تھا۔ ایک تو وہ اپنے جھاڑو لگانے اور جھاڑ پونچھ کرنے کے کام سے فارغ ہو کر گانٹھیں کھولنے اور پیک کرنے میں اُن کی مدد کرتا تھا۔ دوسرے وہ اُن کے ذاتی کام کرنے سے بھی ہچکچاتا نہیں تھا۔ چرن سنگھ، مہتاب سنگھ، کالا سنگھ، پربھو سنگھ، بھی ورکر اس کی معمولی سی خوشامد کر کے درجنوں ایسے کام کروا لیا کرتے تھے۔

لال بادشاہ فلمی ستاروں کا بہت مرید تھا۔ اُس کے گھر میں بیسیوں ایکٹریسوں کی تصاویر دیواروں پر آویزاں تھیں۔ یہ سبھی اس نے فلمی رسالوں سے کاٹ کر فریم کروائی تھیں۔ انھی تصویروں کے بیچ میں اس کا اپنا بھی ایک فوٹو تھا، جس میں وہ ایک اٹھارہ برس کا خوبرو نوجوان، بینٹ، بش شرٹ اور ہیٹ میں ملبوس کھڑا تھا۔ لال جرسی اُس نے بے فکری سے کاندھے پر لٹکا رکھی تھی۔ اُس کے داہنے ہاتھ میں پستول تھا۔ فوٹو میں نقلی پستول بھی بالکل اصلی دکھائی دیتا تھا۔ کتنی ہی فلموں کے ڈائیلاگ اُسے زبانی یاد تھے۔ وہ کسی بھی ایکٹرس کے ہونٹ یا آنکھوں کی تصویر دیکھ کر ہی اُس کا اصلی نام بتا سکتا تھا اور ایک فلمی رسالے کا پانچ روپے کا انعام بھی جیت چکا تھا، جس میں اُس نے صرف ہونٹوں سے بارہ مختلف ایکٹریسوں کے نام کالا سنگھ سے لکھوا کر بھیجے تھے۔ ان پانچ روپیوں میں ورکروں نے چائے پی تھی اور سموسے کھائے تھے اور لال بادشاہ زندہ باد کے نعرے بھی لگائے تھے۔ ایکٹروں اور ایکٹریسوں کے مذہب، اصلی نام، جنم دن، رشتے داریوں اور عشق و محبت کے بارے میں اُسے پورا علم تھا۔ درجنوں فلموں کی کہانیاں ایک سانس میں ہی سنا سکتا تھا۔ فلموں کے بارے میں وہ ہر طرح کی واقفیت رکھتا تھا۔ شہر کے سینما گھروں میں لگی ہوئی کوئی بھی فلم اُس نے دیکھے بغیر نہیں جانے دی تھی۔ دیکھنا صرف ڈیڑھ روپے میں تھا، اسی لیے یہ شوق اُسے مہنگا نہیں پڑتا تھا۔

اُس کا کہنا تھا کہ آنے والے برسوں میں وہ کبھی نہ کبھی فلم کمپنی میں ضرور نوکری کرے گا۔ اور پھر فلم سٹاروں کے ساتھ رہے گا۔ اس وقت تک بمبئی جانے کے راستے میں اگر کوئی چیز سدِّ راہ تھی تو وہ اُس کی بوڑھی ماں تھی، جسے وہ کسی بھی حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

خالصہ ٹریڈرز کے مالک کا نام سردار بہادر روساکھا سنگھ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دِنوں میں اپنے ٹوڈی ہونے کے انعام کے طور پر اور وار فنڈ میں وافر روپیہ فراہم کرنے کے عوض انھیں سردار بہادر کا خطاب ملا تھا، جسے اب وہ آزادی کے بعد بھی اپنے نام کے ساتھ چپکائے ہوئے تھے۔ وہ متوسط طبقے کی نچلی تہوں سے اُبھر کر امیر بنے تھے۔ اس لیے اپنے ملازموں سے کام لینے کا ڈھنگ اُنھیں خوب آتا تھا۔ ایک ہی کام پر لگے ہوئے دو آدمیوں کو ایک دوسرے کے خلاف اُبھار کر خود چین سے رہنا ان کا اصول تھا۔ گوداموں کے سٹاف میں ہر عمر اور ہر طبیعت کے آدمی موجود تھے۔ لیکن کیا مجال جو کسی کے مُنہ سے سردار بہادر کے خلاف ایک لفظ بھی نکل جائے۔ ان میں سے ہر کوئی خود کو سردار بہادر کا مُنہ لحاظ والا "خاص آدمی" سمجھتا تھا اور اپنے خیال میں دوسروں کی نسبت سردار بہادر سے زیادہ قریب تھا اور جسے سردار بہادر اکیلے میں اپنے پاس بٹھا کر اور چائے پلا کر گوداموں میں ہونے والی ہر بات کی بابت پوچھا کرتے تھے۔

لال بادشاہ بھی ایک ایسا ہی مُنہ لحاظ والا آدمی تھا۔ سردار بہادر نے ایک دن بی بی جی کے سامنے اُسے اپنا چھوٹا بھائی، کہا تھا اور پھر اونچی ذات والے لوگوں کو گالیوں سے نوازا تھا، جو اچھوتوں سے برابری کا سلوک نہیں کرتے تھے۔ اُس دن سردار بہادر نے لال بادشاہ کو یہ حکم دیا تھا کہ گوداموں کے بارے میں ہر قسم کی اطلاع اُن تک بہم پہنچاتا رہے کہ کون کون وقت پر آتا ہے۔ کون کام کے وقت لمبی تان کر سوتا ہے اور کس سے کس کے زیادہ گہرے تعلقات ہیں۔ لال بادشاہ بھی اپنی دانست میں ایک ایسا 'خاص آدمی' بن گیا تھا جسے اپنے افسروں سے بھی زیادہ رُتبہ میسّر تھا اور جسے مالک نے خصوصی طور پر اپنی مہربانی سے نوازا تھا۔

لال بادشاہ کہلائے جانے کی کمزوری بھی اُس میں کیسے پیدا ہوئی۔ اس کی بھی ایک داستان تھی۔ ایک بار کسی نئی فلم میں ہیرو کو ایک خاص طرح کی گلا بند جرسی پہنے دیکھ کر اُسے بھی شوق ہوا اور اُس نے اپنی بہن سے ویسی ہی جرسی بُن دینے کو کہا۔ جب جرسی تیار

ہوگئی اور وہ پہن کر آیا تو بی بی جی نے ازراہِ مذاق کہا۔" اس جرسی میں تو وا ہگورو کی سونہہ، تم بالکل بادشاہ دکھائی دیتے ہو۔ لال بادشاہ!"

بی بی جی کو اُس دن سردار بہادر سے چوری گھی کے دو ٹین اپنے مائکے پہنچانے تھے۔

دوسرے دن اس نے گوداموں میں سب سے کہہ دیا تھا کہ بی بی جی نے اُسے لال بادشاہ کہا ہے اور جب ایک آنکھ بند کر کے کالا سنگھ نے بی بی جی اور اُس کے بارے میں ایک نہایت ہی ناواجب لیکن نہایت ہی پیاری بات کہہ دی تھی تو وہ صرف مسکرا دیا تھا اور بس....

دل کی گھٹن اور سرمایہ داری کی چکّی میں پسنے والے کم اُجرت کے مزدور، اگر مالک کی بیوی یا بیٹی کے بارے میں کوئی غیر واجب بات کہہ کر یا سوچ کر خوش ہو لیتے ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ یہ تو نفرت اور انتقام کی وہی پُرانی آگ ہے، جو صدیوں سے لگی ہوئی ہے اور بُری طرح سے دبائے جانے پر نہ معلوم کن کن صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا ان میں سے کوئی بھی صاف صاف نہیں جانتا تھا۔

لیکن پھر بھی یہ بات عام تھی اور چاہے وہ بی بی جی کے بارے میں کھُل کر یا دبے لفظوں میں بات کریں، یہی ایک موضوع ایسا تھا، جس کے بارے میں سردار بہادر کا کوئی بھی خاص الخاص آدمی اُن کو اطلاع نہیں دیتا تھا، کیوں کہ اس حمام میں سبھی ننگے تھے اور کسی ایک کے شکایت کرنے سے سبھی کے پول کھُل جانے کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔ لال بادشاہ بھی اپنے تصوّر میں ایسی عیاشیوں میں گم رہتا اور اس طرح کی باتوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور شاید یہی ایک وجہ تھی کہ وہ لاشعوری طور پر لال بادشاہ کہلائے جانے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔

بارش شروع ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء کی وہ خطرناک بارش جس نے پنجاب میں ہزاروں گھروں کا صفایا کر کے تین بڑے شہروں لدھیانہ، جالندھر اور امرتسر میں قیامت کی بربادی کی تھی۔ لگاتار بارش ہونے کی وجہ سے اُس رات لال بادشاہ گوداموں میں سویا اور اپنے گھر نہیں گیا۔ دوپہر سے شروع ہوئی بارش اور آندھی اتنے زور کی تھی کہ کئی پیڑ جڑ سے اُکھڑ گئے تھے۔ بجلی کے کھمبے اوندھے

مُنہ پڑے تھے۔ گوداموں کے دو سرکے ملازم بھی رات بھر کے لیے وہیں ٹھہر گئے۔ سب خدا سے دعا مانگ رہے تھے کہ اُن کے مکان سلامت رہیں اور وہ صبح سویرے گھر جا کر اپنے بیوی بچوں کا مُنہ خیریت سے دیکھ سکیں، لیکن مکان بچتے نظر نہیں آتے تھے۔ دائیں بائیں دھڑا دھڑ مکانوں کے گرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ گودام ڈھلان کی زمین پر تھے۔ سردار بہادر کا بنگلہ وہاں سے لگ بھگ دو سو گز دور اونچی زمین پر بنا ہوا تھا۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ بجلی فیل ہوگئی۔

لال بادشاہ ایک طرف اکڑوں بیٹھا تھا۔ اسے بڑی سردی لگ رہی تھی۔ رات سے بھوکا بھی تھا۔ گوداموں کے دوسرے نوکر اُس کے دائیں بائیں ہی پیکنگ کے پھٹے پرانے بوروں میں لپٹے پڑے تھے۔ چرن سنگھ اپنی پگڑی جما جما کر سر پر رکھ رہا تھا کہ دروازے سے برساتی کوٹ میں نچڑتے، راڈھ والا مری کین لیمپ ہاتھوں میں لیے سردار بہادر وساکھا سنگھ داخل ہوئے۔ ضرور اُن کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی۔ کیونکہ وہ بولے، تو اُن کی آواز کانپ رہی تھی۔

"چرن سنگھ!" انھوں نے کہا۔ "اب گودام نہیں بچیں گے۔"

چرن سنگھ اپنے بال بچوں کے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ بولا "سردارجی آپ کی جیپ مجھے مل جائے تو میں چلا جاؤں۔ میرا مکان کچا ہے۔ گر گیا تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔"

"جیپ آج یہاں ہوتی تو بات ہی کیا تھی!" سردار جی نے بھرّائی آواز میں کہا۔ "گودام ٹپک رہے ہیں۔ میرا لاکھوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ باہر گلی میں تین تین فٹ پانی کھڑا ہے۔ کچھ گھنٹوں میں پانی اندر گھس آئے گا اور یہاں کمر کمر تک پانی ہو جائے گا۔ مٹھو یار! کوئی مدد کرو۔ گودام خالی کر کے گانٹھیں میری کوٹھی میں اُتار دو۔ دو سو گز کی ہی تو دوری ہے۔ ایک ٹرک کا انتظام میں نے کر لیا ہے۔ بس لوڈنگ کروا کر وہاں پہنچا کر اُتار دو۔ سویرے تک سب گودام خالی ہو جائیں گے... نو بجے ریڈیو پر خبر تھی کہ بارش ابھی چوبیس گھنٹے اور ہوتی رہے گی۔"

پر بھو سنگھ کھڑا ہو گیا — اُس نے کہا "تب تو ہمیں اپنے بال بچوں کا حال بھی دیکھنا ہے۔ میں تو چلا۔ صبح تک اگر سب خیریت رہی تو لوٹ آؤں گا۔"

اس کے پیچھے پیچھے کالا سنگھ اور مہتاب سنگھ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

سردار بہادر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انھیں کوئی راہ نہیں سوجھ رہی تھی۔ انھوں نے

کہا۔" بھوندو! انھیں میں نے بچّوں کی طرح پالا ہے..... انھیں روکو،... روکو انھیں لال بادشاہ!"

لال بادشاہ اُٹھا۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس نے کالا سنگھ اور مہتاب سنگھ کو کندھوں سے پکڑ کر فیصلہ کن انداز میں کہا۔" رُک جاؤ، رُک جاؤ، یارو! بچّے مت بنو! سردارجی کا لاکھوں کا نقصان ہو رہا ہے اور تمھیں اپنے بال بچّوں کی پڑی ہے؟ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے! کام کرو، بہادر بنو! کام کرو یارو! اُٹھو، گانٹھیں اُٹھالو!"

تبھی مکان کے دو ملازم بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔" ہمارے مکان گر گئے سردارجی!" انھوں نے کہا۔

" بال بچّوں کو یہاں لے آؤ!" سردار بہادر نے کہا۔" جانیں تو بچ گئیں نا؟ انھیں میری کوٹھی میں ٹھہراؤ! اور تم دونوں ذرا یہاں ہاتھ بٹاؤ...... واہگورو کے لیے ذرا جلدی جلدی کرو۔ میں تمھارے لیے چائے تیار کرنے کے لیے کہہ آیا ہوں۔!"

سردار بہادر خود گانٹھیں اُٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔

لال بادشاہ نے ساتھ دیا۔ باقی کے سب پہلے تو کھڑے دیکھتے رہے۔ پھر وہ بھی پل پڑے۔

بارش، چھم چھم، دھپ دھپ، دھائیں.... دھڑائیں،..... مکان گر رہے تھے۔ ٹرک گوداموں کے گیٹ کے ساتھ لگا تھا۔ سردار بہادر خود ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ایک دو، تین، ایک گانٹھ، دوسری گانٹھ، تیسری گانٹھ.... ٹرک آخر بھر اگیا۔

" زندہ باد! شیرو زندہ باد!" لال بادشاہ نے کہا۔" چڑھ جاؤ اوپر۔ وہاں جاکر اُتارنا بھی ہے!" ٹرک پر ترپال دے دی گئی ـــــ لال بادشاہ کود کر اوپر چڑھ بیٹھا۔ سردار بہادر کا رسوئیا، مالی، گڑھوالی نوکر ـــــ سب آگئے تھے۔

ایک ٹرک اور بھر اگیا، خالی کیا گیا۔

بارش، آندھی، موسلا دھار پانی..... ہوا کی شائیں شائیں، پانی پانی، موسلا دھار پانی ـــــ!

دوسرا ٹرک بھر اگیا، خالی کیا گیا۔

پھر تیسرا،

پھر چوتھا!

پھر پانچواں!

چائے آئی۔ بی بی جی۔ خود بالٹی بھر کر چائے لائی تھیں۔ کھڑے کھڑے ہی سب نے اپنے ہونٹ اور گلے جلائے۔ اب گوداموں میں ایک ایک فٹ پانی بھر رہا تھا۔ صبح ہونے میں تھوڑی دیر تھی، لیکن وہی بارش تھی، وہی پانی تھا، وہی سردی تھی اور وہی کام تھا۔

ایک ٹرک اور بھر اگیا۔ خالی کیا گیا۔

دن کے دس بج گئے۔ لگاتار کام کرتے ہوئے پورے دس گھنٹے گذر چکے تھے۔ گودام ابھی تک ایک چوتھائی بھی خالی نہیں ہوئے تھے۔ سبھی گودام اب چھاننی کی طرح ٹپک رہے تھے۔ سبھی گوداموں میں قیمتی ریشمی اور اونی کپڑے کی گانٹھیں لگی ہوئی تھیں۔ کسی گانٹھ کے ایک کونے پر بھی اگر ٹپکا پڑ گیا تو سمجھیے ساری گانٹھ خراب۔

ایک ٹرک اور بھر اگیا، خالی کیا گیا...

ایک اور،

ایک اور۔

شام کے چار بج گئے۔ لال بادشاہ کے جسم سے بھاپ اُٹھ رہی تھی، وہ بے طرح کانپ رہا تھا۔ وہ ماں، بہن، اپنے گھر، اپنی لال جرسی، فلم سٹاروں کی تصویریں، سبھی کچھ بھول چکا تھا، صرف کام اُسے یاد تھا، گانٹھیں یاد تھیں، سردار بہادر کا نقصان یاد تھا اور یہ بھی یاد تھا کہ سردار بہادر نے اُسے اپنا بھائی کہا تھا۔ اور .... اور یہ بھی یاد تھا کہ بی بی جی خود بالٹی بھر کر چائے لائی تھیں۔

آدھ گھنٹہ اور گذرا کہ پربھو سنگھ، مہتاب سنگھ اور چرن سنگھ بھی چپکے سے کھسک گئے۔ گودام ابھی مال سے آدھے بھرے تھے۔ پانی دو دو فٹ بھرا تھا۔ گانٹھیں اب اونچے ریکوں پر ہی رہ گئی تھیں اور اگر انھیں نکالا نہ گیا تو دو تین گھنٹوں میں اُن تک پانی پہنچنے ہی والا تھا۔

"اب ..... اب ...... ؟" بی بی جی نے گھبراتے ہوئے کہا۔ وہ ایک بار پھر اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر لائی تھیں، لیکن اب سوائے لال بادشاہ کے اور پینے والا کوئی نہیں تھا۔

"اب کیا ہوگا لال بادشاہ!" سردار بہادر نے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

ایک اکیلا لال بادشاہ! چائے پی کر اُس نے پیالی پھینکی اور اکیلا ہی ایک گانٹھ اٹھا کر لے آیا۔

"شاباش! سردار بہادر نے کہا۔

ایک گانٹھ اور، پھر اور — اکیلے ہی لال بادشاہ نے ٹرک بھر دیا۔ وہ ہانپنے لگا۔ جسم میں درد محسوس ہونے لگا۔ پھیپھڑوں میں جیسے سانس لینے کی بھی طاقت نہ رہی۔

بارش بڑھتی جا رہی تھی۔ پانی اوپر چڑھ گیا تھا۔ آندھی اُسی طرح بنا رُکے چل رہی تھی۔ بارش اور آندھی کے ایک ساتھ آنے کی وجہ سے مکان لگاتار گرتے جا رہے تھے۔ سردار بہادر کے ورکروں میں سے صرف لال بادشاہ کام میں جٹا ہوا تھا، اُسے کچھ یاد نہ تھا۔ بارش اور طوفان کا زور بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اب تو جیسے جسم بھی سُن ہو چکا تھا۔ درد کا احساس نہیں تھا۔ بس وہ پوری تیزی اور پھرتی سے گانٹھیں اُتار رہا تھا، گانٹھیں چڑھا رہا تھا۔ اس کا دماغ ایک بگولے کی طرح اُڑ رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے رہ رہ کر دھند چھا جاتی تھی۔ وہ کام کر رہا تھا۔ بس کام، کام، کام -!

رات کے دو بجے تکان سے چور ہو کر وہ گر پڑا — بارش ابھی اور ہونے کی پیشن گوئی تھی۔ گوداموں میں اب تین تین فٹ پانی بھر رہا تھا۔ صرف سب سے اونچے ریکوں پر سے گانٹھیں اُتارنی باقی رہ گئی تھیں۔

جب لال بادشاہ کو ہوش آیا تو پہلی آواز اُسے سنائی دی، وہ شائیں شائیں کرتی طوفانی ہوا کی تھی۔ وہ سردار بہادر کی کوٹھی کے دالان میں فرش پر پڑا تھا۔ کسی نے اُس کے اوپر ایک کمبل اوڑھا دیا تھا۔ اُس کا عضو عضو دُکھ رہا تھا۔ باہر رات کا اندھیرا تھا۔ وہ پورے چوبیس گھنٹے سویا رہا تھا۔ بارش لگاتار ہو رہی تھی۔ سردار بہادر کے کُنبے کے لوگ شاندار کمروں میں رضائیوں

ہیں سو رہے تھے۔

اس نے کروٹ لینی چاہی لیکن جسم میں درد اس قدر شدید تھا کہ نہ لے سکا۔ وہ پھر سو گیا۔ دوسری بار جب وہ بیدار ہوا تو دن کی روشنی تھی۔ بارش رک گئی تھی اور سردار بہادر پاس کھڑے اُسے پاؤں سے جگانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"گودام؟" اُس کے منہ سے پہلا بول پھوٹا۔

"سب بچ گئے، لیکن . . . . . ." سردار بہادر نے اداس لہجے میں کہا۔ "دس گانٹھیں بھیگ گئیں۔ پانچ ہزار کا نقصان ہوا۔"

"میں جاؤں اب؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں لال بادشاہ!" پیچھے کھڑی بی بی جی نے کہا۔ "نہ معلوم تمھاری ماں کا کیا حال ہے۔ تمھارے محلّے میں تو سُنا ہے اب بھی کمر کمر تک پانی کھڑا ہے۔"

وہ اُٹھا — چار دنوں کے بعد پہلی بار اُسے اپنی ماں کا خیال آیا۔ اپنی بہن کا خیال آیا، اپنے اُس چھوٹے سے گھر کا خیال آیا۔ جہاں اُس کی فلمی ستاروں کے فیشن میں سلوائی ہوئی پتلونیں تھیں، لال جرسی تھی، دیوار پر درجنوں ایکٹریسوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔

پندرہ دن گذر گئے۔ لال بادشاہ کی ماں چھت کے گرنے سے نیچے دب کر مر گئی تھی۔ بہن کا کیا ہوا کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ شاید مر گئی ہو، یا غنڈے اُٹھا کر لے گئے ہوں۔ سامان سب بہہ گیا تھا۔ میونسپل کمیٹی والوں نے ملبہ ہٹایا تو سارے سامان میں سے صرف ایک تصویر سلامت بچی تھی اور وہ اُس کی اپنی تصویر تھی — وہی جس میں وہ سُرخ جرسی پہنے، ہاتھوں میں نقلی پستول لیے، سینہ تانے کھڑا تھا۔

وہ اب اُداس رہنے لگا۔ سرکاری کیمپ میں، جو سیلاب زدہ لوگوں کے لیے کھولا گیا تھا۔ ایک خیمے میں چُپ چاپ پڑا رہتا۔ گوداموں میں ایک ہفتے کی تاخیر کے بعد اُس نے ڈیوٹی پر آنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی مصیبت میں مبتلا ہونے کے باوجود جب گوداموں کی از سرِ نو

صفائی ہوئی اور گانٹھیں دوبارہ سجائی گئیں تو اس نے جی جان توڑ کر کام کیا اور ایک بار جب پھر سردار بہادر نے اُسے اپنے چھوٹے بھائی اور لال بادشاہ کہہ کر پکارا اور بی بی جی نے اُسے اپنے ہاتھوں سے مٹی کی ٹھلیا میں چائے پیش کی تو وہ چمک اُٹھا۔ اس شام وہ رات کے گیارہ بجے تک گوداموں میں کام کرتا رہا۔

تنخواہ کا دن آ پہنچا۔

اُسے یقین تھا کہ اُس کی اَنتھک محنت اور اُس کے نقصان کا اندازہ لگا کر سردار بہادر پگار سے زیادہ پچاس روپے اُسے ضرور دیں گے اور ان روپوں کو سرکاری ملی ہوئی گرانٹ میں شامل کر کے وہ کھپریل کی چھت ضرور ڈلوا سکے گا۔ لیکن انگوٹھا لگانے کے بعد جب ہرچرن سنگھ نے اُس کی ڈیڑھ سو کی پگار میں صرف اَسّی روپے دیے تو وہ بھونچکا رہ گیا۔

اُس نے ایک فلمی ستارے کی اُس فلم کے ڈائیلاگ کی نقل کی جو وہ مزدور لیڈر کے طور پر بولا تھا — "مالک، یہ اَسّی روپے ہیں کتنے دِنوں کی پگار ہے یہ؟"

چرن سنگھ نے جواب دیا۔ "سولہا دِنوں کی! سب لوگوں کی اتنے دِنوں کی پگار کٹ رہی ہے۔ جتنے دن گوداموں میں کام نہیں ہوا، یا بارش کے بعد وہ غیر حاضر رہے۔ چار دن بارش کے اور بارہ دن تمہاری حاضری رجسٹر میں نہیں لگی۔ کل ہوئے سولہا دن۔"

"لیکن ان چار دنوں میں تو میں نے کام کیا ہے۔ ساری رات گانٹھیں اُٹھا کر!" اُس نے پھر فلمی مزدور لیڈر کی طرح کہا۔ چرن سنگھ صرف اتنا کہہ سکا۔ "تم سردار بہادر کے پاس جاؤ۔ میرا بھیجا مت چاٹو۔!"

اُس نے جھاڑو اٹھائی اور بھاگتا ہوا سردار بہادر کی کوٹھی جا پہنچا۔ وہ بی بی جی کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

پہنچتے ہی اس نے کہا۔ "سردار جی، مجھے یہ صرف اَسّی روپے ملے ہیں!" اُس کا لہجہ اب بھی فلمی تھا۔

"ہاں لال بادشاہ! میں نے ہی تنخواہوں کا اندراج کیا ہے۔ مجھے علم ہے ...... اور تمھیں کیا ملتا؟ اُن دنوں کام ہوا ہی کہاں ہے؟ پانچ دن تو کام ویسے ہی بند رہا اور پھر بارہ دن

تم غیر حاضر رہے!"

"لیکن مالک! میں تو یہاں تھا! میرا مکان، میری ماں .....؟"

"لال بادشاہ!" سردار نے ٹوک کر کہا۔ "میرا پانچ ہزار کا نقصان ہوا ہے۔ وہ میں کس سے وصول کروں؟ خدا سے؟ میں نے ان پانچ دنوں کی تنخواہ کسی کو بھی نہیں دی۔ تم تو میرے چھوٹے بھائی ہو، اگر تم نے ہی ضد کی تو باقی کے لوگ میرا پیچھا کہاں چھوڑیں گے؟!"

بی بی جی نے کہا "ہاں لال بادشاہ! ہم نے تمھیں غیر کب سمجھا ہے؟"

اس دن پہلی بار نہ جانے لال بادشاہ کو کیا ہوا۔ اس کا مُنہ تمتما گیا۔ وہ غصّے سے کانپنے لگا۔ پھر چیخ کر بولا "تم مجھے بھوندو کہا کرو! سردار جی!"

اور جھاڑو وہیں پھینک کر وہ بھاگ نکلا — سڑک پر بھاگتا ہی چلا گیا۔

○○

زندگی، موت اور بڑھیا

زرد، جھرّیوں بھرا چہرہ، پوپلا منہ، بغیر پلکوں کے بہتی ہوئی گندی آنکھیں، سفید، ہلکا پیلا رنگ، لٹے کھلے بال، پھٹی پرانی قمیض، ٹوٹی ہوئی جوتی، ٹیڑھی میڑھی ہاتھ کی لاٹھی۔

لیکن اس کے باوجود بڑھیا قیامت سے کم نہ تھی۔ میرے اپنے گھر کے پاس۔ دلاری دائی کے دروازے کے باہر، دیوار پر الٹا ہاتھ اور ہاتھ کی پشت سے پیشانی ٹکائے دلاری کی ساس دن بھر بیٹھی رہتی۔ صبح دفتر جاتے، شام دفتر سے لوٹتے، ایک بار نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا میرا معمول سا بن گیا تھا۔ نوّے برس کی عمر ــــ لوگ کہا کرتے ــــ خاوند کو مرے ہوئے ساٹھ برس ہو گئے۔ دو بیٹوں کو دوسری دنیا گئے ہوئے تیس برس ہونے کو آئے۔ آخری بیٹا دلاری دائی کا خاوند دس برس پہلے اپنی بیوی کی بدچلنی کی وجہ سے اسے اور ماں کو چھوڑ کر کسی اور شہر چلا گیا۔ بڑھیا پھر بھی جیتی ہے۔" ایک بار رام دیال کریانہ فروش نے کہا۔ "بابو جی، نہ جانے کیوں جی رہی ہے یہ بڑھیا! اسے تو مر جانا چاہیئے تھا۔ کچھوے کی عمر بھوگ رہی ہے۔ کون ہے اب اس کا؟ خاوند مر گیا، بیٹے گئے۔ دلاری دور سے دھتکارتی ہے، روٹی تک تو محلے والوں سے مانگ کر کھاتی ہے۔ دو قدم چل نہیں سکتی۔ چار چار گھنٹے نالی پر بیٹھی گندگی پھیلاتی رہتی ہے۔ نہ جانے کیوں جی رہی ہے یہ بڑھیا!"

رام دیال نے کہا۔ دینا ناتھ نے کہا۔ پھر ایک بار کرشن لعل بزاز نے بھی یہی بات کہی۔
"کتنی گندی ہے صاحب۔ آپ تو سکوٹر چلایا اور دفتر چلے گئے۔ میں کبھی کبھی دن بھر گھر ہی ہوتا ہوں۔
سر اٹھانے کی تو جسم میں سکت نہیں، لیکن زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ اُدھ ننگی سی
ٹوٹی چارپائی پر پڑی رہتی ہے۔ میری گھر والی نے کپڑے پہن کر بیٹھنے کو کہا تو بے چاری کی
شامت آگئی۔ میری تو سات پشتوں کو گالی بکتی رہی۔ کیا کیا جائے؟ دُلاری سے کوئی گلہ کرے بھی
تو کیا؟ اُسے تو خود یہ چین نہیں لینے دیتی۔"

صبح دفتر جاتے، شام کو دفتر سے واپس آتے، بڑھیا پر نگاہ پڑتی، دُھرتی کا بوجھ ہے۔
دل کہتا۔ اب سچ مچ اسے مر جانا چاہیے۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ کسی اور کی آئی موت پر مر جائے تو
یہ کتنی خوش ہو۔ موت اس کے لیے نجات ہے۔ زندگی تو ایک بھاری بوجھ ہے جو اُسے اٹھانا
پڑ رہا ہے۔ ایک ایک سانس کے لیے کتنی تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے اسے۔ ایک ایک دن کیسے
گذرتا ہے اس کا؟ صبح کٹورہ لیے چائے مانگنے چیونٹی کی چال سے چلتی میرے گھر آ رہی ہے تو
شام کو دو روٹی اور دال کی کٹوری کے لیے رام دیال کی چوکھٹ پر ہے۔ بیٹا ماں کی قینچی سی
زبان اور بیوی کی بے راہ روی سے تنگ آکر بھاگ گیا ہے۔ نہ معلوم زندہ بھی ہے یا نہیں
یہ کس کے لیے زندہ ہے؟ اکثر میں اس سوچ میں مگن رہتا۔ رات کو پڑھنے میں مصروف ہوتا تو دور
سے بڑھیا کی کانپتی ہوئی لیکن آرے کی طرح تیز آواز سنائی دیتی۔ بڑھیا، دُلاری اور اس
کے کسی گاہک کو گالیوں پر گالیاں سنا رہی ہوتی۔ پھٹکار بھی دیتی تو سات پشتوں تک کو۔۔۔۔
"اری کنجری، تیری یہ کرتوتیں؟ میرا بیٹا کھا گئی! تیرے یہ لچھن!"۔۔۔ پڑھنے سے طبیعت اچاٹ
ہو جاتی۔ بڑھیا ہے یا قیامت! نوّے برس کی ہونے کو آئی! اسے کسی کی آئی کیوں نہیں آجاتی!
یہ مر کیوں نہیں جاتی۔

اچارج گھرانا۔ ایک نہیں۔ محلّے میں دس اچارج گھرانے ہیں۔ اچارج، جن میں مُردے
کا کفن تک دان میں لینا روا ہوتا ہے، جن کا کسی کے گھر میں آنا تو درکنار۔ گھر کے سامنے سے گذرنا
بھی منحوس سمجھا جاتا ہے، جو اپنے گھروں میں اپنی چارپائیاں اکثر اُلٹے رُخ کھڑی کیے رکھتے
ہیں تاکہ شہروں میں موتیں زیادہ ہوں۔ بیماری پھیلے، آگ لگے، کریا کرم بیشتر ہوں اور دان زیادہ

سے زیادہ ملے۔ تقسیمِ وطن کے بعد جب ہم اس شہر میں نئے نئے آئے تو کسی کو بھی اپنے نئے پڑوسیوں کے بارے میں علم نہیں تھا کہ کون کہاں سے آیا ہے۔ کیا کام کرتا ہے۔ کس قبیل سے تعلق رکھتا ہے اس لیے جب کچھ مہینوں کے بعد شرمیتی جی نے بتایا کہ ہمارا گھر چاروں طرف سے اچارج لوگوں کے گھروں سے گھرا ہوا ہے' اور یہ ہر نئی صبح مرنے والوں کے گھروں سے کریاکرم کی نئی چارپائیاں، رضائیاں اور دیگر سامان لیے آتے دیکھے جاتے ہیں تو بڑا افسوس ہوا، مکان الاٹ ہوا بھی تو کہاں! لیکن پھر سوچا کیا فرق پڑتا ہے۔ دوستی، تعلق اور ملت تو بنانے سے ہی بنتے ہیں۔ ہم اپنے کام سے کام رکھیں گے انھیں بُلائیں گے نہیں۔ دس برس گذر گئے۔ اچارج لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے خوش یا ناراض رہتے۔ ہمیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس مدت میں اُن کی لڑکیاں لڑکے جوان ہو کر بیاہے گئے' جو بچے ہوئے وہ بڑے ہو گئے' لیکن سماجی طور پر ہم اُن سے دُور ہی رہے۔۔۔۔۔

اچارج گھرانا — دُلاری کا خاوند شہر چھوڑ کر چلا گیا تو اُس کا دھندہ چمک اُٹھا۔ اس کی برادری میں سب لوگ اُس کے لچھن جانتے تھے اس لیے وہ خاموشی سے برادری سے خارج کر دی گئی۔ اب شمشان پر اُس کی باری نہ رکھی جاتی۔ لیکن اُس کی ساس بدستور برادری اور شمشان سے ملنے والے دان میں برابر کی حصہ دار تھی۔ ہر پندرہ دنوں کے بعد اس کی باری کا آیا ہوا کریاکرم کا سب سامان اُسے ملتا تو دکاندار لوگ خود آکر نقد قیمت ادا کرنے اور اونے پونے داموں میں خرید کر لے جاتے اور بڑھیا نوٹ اپنی پوٹلی میں باندھتی دیکھی جاتی۔ رشتے کا ایک بھتیجا ہی یہ کام بہ خوبی نپٹا دیتا۔ اُس کے پاس ازار بند سے بندھے ہوئے سو ڈیڑھ سو روپے بھی تھے، اور کانوں کی بالیاں بھی تھیں۔ اپنی بہو دُلاری سے وہ برابر کی ٹکر لیتی۔ ایک ایک کی چار چار سُناتی، لیکن اپنے سب سے چھوٹے پوتے سے وہ بہت پیار کرتی۔ دس بارہ برس کا لڑکا، جس میں دنیا کے سب عیب تھے، دادی سے ہمیشہ بے رُخی سے پیش آتا۔ پیٹنے سے بھی دریغ نہ کرتا، لیکن بڑھیا پھر بھی اُسے چار آٹھ آنے خرچ کے لیے دے دیتی۔

ایک دن دفتر سے لوٹتے ہوئے بڑھیا کو چوکھٹ پر نہ پایا۔ گھر میں داخل ہوا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بڑھیا سامنے کے دالان میں پیڑھی پر بیٹھی اپنی تیز قینچی سی آواز میں شرمیتی سے باتیں کر رہی تھی اور ساتھ ہی وہ میلے کپڑے میں کچھ باندھ رہی تھی۔ بڑی حیرانی ہوئی۔ اس سے پہلے روٹی،

سالن یا چائے کے لیے آتی بھی تو دروازے پر ہی بیٹھ کر آواز دیتی۔ میں اندر گیا۔ کپڑے بدلے۔ شریمتی جی آئیں تو انھوں نے اپنے آپ ہی کہا۔ "بے چاری کو میرٹھ سے اپنے بیٹے کی چھٹی آئی ہے۔ وہ وہاں بیمار ہے۔ مجھ سے خط لکھوانے آئی تھی۔ میں نے کچھ آٹا وغیرہ بھی دے دیا ہے۔"

دن گذرتے گئے۔ اب میں اکثر اُسے اپنے گھر پر بیٹھے دیکھتا۔ شریمتی جی بھی اب اُس کے ساتھ فراخ دلی سے پیش آتیں۔ آٹا دیتیں، گھی بھی کٹوری بھر دے دیتیں۔ اپنے پرانے کپڑے دے کر اُسے تن ڈھانپنا سکھاتیں۔ چائے بنا کر لوٹے میں اُس کے سامنے رکھتیں۔ کبھی کبھی نقد پیسے بھی دے دیتیں۔ وہ پیڑھی پر بیٹھی، اپنی ہتھ لٹھیا پر ہاتھ کی پشت سے سر ٹکائے کتر کتر باتیں کیے جاتی۔ اُس کے ادھر آنے کی وجہ سے ایک دو بار دُلاری بھی اُس کی غیر حاضری میں اِدھر آئی، تاکہ شریمتی جی اُس کے بارے میں کوئی غلط رائے قایم نہ کرلیں۔ گھر پہنچتا تو کبھی کبھی یہ دلچسپ باتیں سننے کو ملتیں۔

ایک دن معلوم ہوا کہ دُلاری کا چھوٹا لڑکا گھر سے بھاگ گیا ہے۔ اور دادی کی صندوقچی سے پچاس روپے بھی نکال کر لے گیا ہے۔ اگرچہ وہ خود بڑھیا کا پروردہ تھا اور وہ خود اُس کی زیادتیوں کو بھی برداشت کرلیتی تھی۔ تو بھی آج صبح سے گالیاں بک رہی ہے۔ نہ کچھ کھایا ہے نہ کچھ پیا ہے۔ دُلاری سے روپے مانگتی ہے لیکن وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ آخر شریمتی جی اور دیگر کچھ عورتوں نے چندہ کر کے روپے پورے کر دیے تو گلی میں امن ہوا۔

پھر ایک دن معلوم ہوا کہ دُلاری سے کان سے گرا ہوا ایک کانٹا گم ہو گیا ہے اور وہ اپنی ساس پر چوری کا الزام لگا رہی ہے لیکن بڑھیا کسی کو بھی اپنا بکس کھول کر نہیں دیکھنے دیتی۔ اور دُلاری کی ایک گالی کا جواب دس گالیوں سے دیتی ہے۔

کئی دنوں تک ہنگامہ رہا اور جب تک کہ دُلاری کو اپنے کانٹے کا ٹوٹا ہوا حصہ چارپائی کی پائنتی میں اٹکا ہوا نہ ملا خاموشی نہ ہوئی۔ ہر دوسرے دن ایک نہ ایک جھگڑا ہو جاتا۔ کبھی دُلاری بڑھیا پر ہاتھ اُٹھا بیٹھتی تو وہ چیخ چیخ کر آدھا شہر اکٹھا کر لیتی۔ محلے والوں کا چین حرام ہو جاتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر ہاتھا پائی اور چھینا جھپٹی میں بڑھیا کی بائیں کلائی ٹوٹ گئی۔ پھر جو ہنگامہ ہوا تو

پورے پندرہ دنوں کے بعد چین ملا۔ بڑھیا کا ایک ہاتھ ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔ وہ اُس پر میلی کچیلی پٹّی باندھے رکھتی، سینک کرتی رہتی، ہلدی اور گھی کی مالش کرتی رہتی۔

بڑھیا میں شریمتی جی کی یہ دلچسپی آخر رنگ لائی اور گھر سے چھوٹی موٹی چیزیں گُم ہونے لگیں۔ پہلے چمچے اور کٹوریاں گُم ہوئیں۔ پھر ایک دن چاندی کا گلاس چوری ہو گیا۔ ہزار بار کہا کہ بڑھیا ہی کی کارستانی ہے۔ دُلاری نے تو ایک چمچہ بھی بڑھیا کے کپڑوں سے نکال کر دکھا دیا۔ لیکن شریمتی جی نہ مانیں۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا نوکر بدلا تی گئیں۔ بڑھیا اپنے بارے میں چونکہ میری رائے اچھی طرح سے جانتی تھی، اس لیے میرے سامنے کم ہی آتی، لیکن میری غیر حاضری میں وہ کئی بار آجاتی۔ شریمتی جی کی کرسی یا پلنگ کے ساتھ پیڑھی پر بیٹھی رہتی۔ چُپ رہنا اُس نے سیکھا ہی نہ تھا، اس لیے میں حیران تھا کہ شریمتی جی اُس کی باتیں کیسے سُن لیتی ہیں۔

کئی دن گذر گئے، ایک شام آیا تو دیکھا بڑھیا گھر کے سامنے مٹی میں بیٹھی تھی۔ دُلاری کے گھر رونا دھونا ہو رہا تھا۔ دری بچھی ہوئی تھی۔ اچارج برادری کے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑھیا کھُلی کھُلی آواز میں رو رہی تھی اور بار بار سر پٹک رہی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اُس کا بیٹا دُلاری کا خاوند مر گیا ہے۔ پرانا افیونی تھا۔ ایک دن زیادہ کھالی اور صبح مُردہ پایا گیا ہے۔ میرٹھ سے تار آنے پر معلوم ہوا ہے۔

بیٹے کی موت کے بعد بڑھیا کی حالت زیادہ دگرگوں ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی زندگی کا ایک آخری مقصد بھی ختم ہو گیا ہو، جیسے اُس کے جینے کا اب کوئی جواز نہ ہو۔ اُس کا بھتیجا اب شمشان سے حاصل ہونے والا سامان خود ہی ہڑپ جاتا۔ وہ اُسے ہزار ہزار گالیاں سُناتی، لیکن اب بے بس تھی۔ اُس کا چہرہ اور سکڑ گیا۔ جھرّیاں زیادہ گہری ہو گئیں۔ کمر کمان کی طرح جھُک گئی۔ طاقت بالکل جواب دے گئی۔ مٹھی بھر ہڈّیوں کا ڈھانچا سا رہ گئی۔ البتہ کبھی ہمارے گھر آتی تو پہلے کی طرح لاٹھی ٹیکتی، چیونٹی کی چال چلتی ہوئی آتی۔ آدھ گھنٹہ، گھنٹہ بیٹھتی مطلب کی بات کرتی۔ چیز لیتی اور چلی جاتی۔ دُلاری اب بے خوف و خطر کھُلے عام اپنا دھندہ کرنے لگی تھی۔ اس لیے بڑھیا اپنی سبھی مجبوریوں اور کمزوریوں کے باوجود انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے اپنے طعن و ملامت کے فقرے اور زیادہ تیز کر دیتی۔ حیرت ہوتی تھی کہ اُس ہڈیوں کے ڈھانچے

میں اتنی آگ کیسے بھری پڑی ہے۔ اتنا شر کہاں سے آیا ہے؟
گھر میں بات ہوتی تو کہتا دھرتی کا بوجھ ہے۔ یہ مر کیوں نہیں جاتی؟ اس زندگی سے کیا موت بہتر نہیں؟"

اور شرما جی گہرے فلسفیانہ انداز سے سر ہلاتیں "ہاں بڑھیا کا اب کون ہے؟ بیٹا بھی مر گیا۔ دو پوتے ہیں.... بڑا تو پاگلوں کی طرح سارا دن بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا ہے۔ البتہ ایک چھوٹا ہے۔ چار بار گھر سے بھاگ چکا ہے۔ دادی کو کبھی کبھی پیٹتا بھی ہے لیکن مرنے کو کس کا جی چاہتا ہے۔؟"

انفلوئنزا پھیلا تو سارا شہر ہی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ بڑھیا گندگی سے لت پت پڑی رہتی تھی۔ ایک دن صبح معلوم ہوا کہ بخار میں بے ہوش پڑی ہے۔ ساتھ ہی نہ معلوم کیا کھا لیا ہے۔ ہیضے کی سی حالت ہے۔ اس دن تو میں نے بھی ذرا سخت الفاظ میں اپنی بیوی کو اس کے پاس جانے سے روکا۔" اب بڑھیا مر جائے گی!" سبھی کی رائے تھی۔ ایک دن اور گذرا تو بے ہوش بڑھیا کو کیمپ ہسپتال میں لے جانے کے لیے میونسپلٹی کی گاڑی آئی۔ ناک پر کپڑا چڑھائے میونسپلٹی کے دو خاکروبوں نے اُسے اٹھا کر گاڑی میں لٹایا۔ گندگی سے لت پت نیم برہنگی کی حالت میں بے ہوش بڑھیا کو لیے ہوئے میونسپلٹی کی گاڑی جب گلی سے نکل گئی تو جیسے سب میں جان پڑ گئی۔ جیسے بڑھیا کا جنازہ اٹھ گیا ہو۔ دُلاری نے بھی چین کا سانس لیا اور وہ اس رات کافی دیر تک بڑھیا کی کوٹھڑی میں کچھ تلاش کرتی دیکھی گئی۔ اس کا چھوٹا بیٹا، بڑھیا کا پروردہ پوتا اس کے ساتھ لالٹین لیے ہوئے تھا۔

دو دن کے بعد دُلاری کا چھوٹا بیٹا بھی بیمار پڑ گیا لیکن اسی شام میونسپلٹی والے بڑھیا کو واپس چھوڑ گئے۔ میں نے دیکھا، وہ اسی طرح سے دیوار کے ساتھ پیشانی ٹکائے، آنکھیں بند کیے دُلاری کے دروازے پر بیٹھی ہے۔ اس کے کپڑے زیادہ پھٹے ہوئے ہیں۔ اب اس میں زندگی کی ایک معمولی سی رمق ہے۔ ایک کمزور سا دھاگا ہے، جو نہ معلوم کب ٹوٹ جائے۔ دُلاری کی گالیوں کا جواب بھی اب اس کے پاس نہیں۔ کھانس رہی ہے۔ گردن کی کمزور رگیں پھول جاتی ہیں۔ آنکھیں باہر نکل آتی ہیں، لیکن جیے جا رہی ہے۔" امریکہ میں تو ڈاکٹر لوگ ایسے مریضوں کو خود اصرار کرنے پر ام نہیں

زہر کا ٹیکا لگا دیتے ہیں۔" امریکہ سے لوٹ کر آئے نیر صاحب نے اُس کے بارے میں کہا۔
وہ انہی دنوں گلی کے دوسرے موڑ پر نئے بنے ہوئے مکان میں آئے تھے۔

دُلاری کا چھوٹا لڑکا اتنا سخت بیمار ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ بڑھیا کو اس لڑکے سے بہت محبت تھی۔ سبھی جانتے تھے۔ میں نے بھی جاتے ہوئے از راہِ ہمدردی پوچھ لیا " مائی لڑکے کا کیا حال ہے ؟"

بڑھیا نے بے نور آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس میں شاید پہچاننے کی حس بھی نہیں رہی تھی۔ بولی " بڑا بے آرام ہے۔ ساری رات تڑپتا رہا ہے، میرے رام، تو بچّے کو سُکھ دے۔"

میں چلا گیا۔ کام سے لوٹا تو معلوم ہوا کہ لڑکے کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہے۔ بارہ تیرہ برس کا کھیلتا کودتا بچہ، انفلوئنزا ہوا اور ایسا ہوا کہ رات دس بجے کے قریب اُس کی مَوت ہو گئی۔

دُلاری کے گھر میں کہرام مچا تو میں بھی گیا۔ بڑھیا اسی طرح دروازے سے سر ٹکائے خاموش آنسو بہا رہی تھی۔ او نچا رونے، چھاتی پیٹنے اور ماتم کرنے کی طاقت اُس میں نہیں تھی۔ بیماری نے رہی سہی طاقت بھی نچوڑ لی تھی۔ مجھے جاتے دیکھ کر رام دیال اور کرشن لال وغیرہ بھی آ گئے۔

" بڑھیا بے چاری ....." کرشن لال نے کہا " یہ دن بھی اسے دیکھنا تھا۔ کاش اس معصوم بچّے کی جگہ پر یہی مر جاتی ۔!"

بڑھیا نے شاید یہ بات سُن لی۔ اس نے دیوار سے سر اُٹھایا، لاٹھی کا سہارا لے کر ہزار دقتوں سے اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ہمارے سامنے آئی۔ بے نور آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔ میں نے سمجھا اب وہ لاٹھی چھوڑ کر گر پڑے گی۔ سر پٹک پٹک کر روئے گی، مَوت کے لیے گڑگڑائے گی، لیکن اُس نے اپنا پوپلا مُنہ کھولا اور پھر ہم پر گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ " مریں تمہارے ہوتے سوتے! مریں تمہارے گھر والے۔ مجھے کہتے ہیں۔ میں مر جاتی!"

مجھے اندر موت کے کہرام اور باہر زندگی کے کہرام میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔

○○

پتھر میں پھول

ہرچرن سنگھ نے چھٹی جماعت کی ٹرانسلیشن کی کتاب کے پروف دیکھتے ہوئے ایک نگاہِ غلط انداز سامنے کی دیوار پر ڈالی۔ بوڑھے کلاک پر گیارہ بجا چاہتے تھے۔ باہر مکمل اندھیرا تھا۔ اندر صرف ایک مرکری ٹیوب روشن تھی۔ آخری کمرے سے بڑی سرکلر مشین کی گھڑگھڑاہٹ بدستور آرہی تھی۔ کمپوزیٹر بنسی لال اپنے شیڈ میں ابھی تک آخری فارم کمپوز کرتے ہوئے گا رہا تھا۔

ہرچرن سنگھ کے کمرے میں فقط دو میزیں تھیں۔ ان دو میزوں کے درمیان ایک تختہ لگا کر تیسرے آدمی کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنالی گئی تھی۔ اس پر اُدھیڑ عمر ایک آنکھ والا بابو اِندر راج بیٹھا کرتا تھا۔ آج کلدیپ آرٹسٹ اور بابو اندر راج بہت جلد گھر چلے گئے تھے اس لیے دونوں میزیں خالی پڑی تھیں اور ہرچرن سنگھ اکیلا کام کرتے ہوئے وحشت سی محسوس کر رہا تھا۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر فیکٹری انسپکٹر گھومتا ہوا ادھر آنکلا اور اس نے پریس کو چلتا ہوا دیکھ لیا تو اوور ٹائم کے لالچ میں پٹنے سے بھی دینا پڑے گا اور اگر پھر بھی لیبر انسپکٹر نہ مانا تو چالان ہو جائے گا۔ مالک الگ ناراض ہوں گے اور جرمانے کے نتیجے کے طور پر رام سنگھ مشین مین، بنسی لال کمپوزیٹر اور اس کی اپنی ایک چوتھائی تنخواہ کٹ جائے گی۔ دس بجے کے بعد پریس چلانا خلافِ قانون تھا۔ بجلی کی سپلائی یوں ہی بہت کم تھی۔

ہرچرن سنگھ نے ہولڈر رکھ دیا۔ ایک طویل انگڑائی لی اور پھر ہولڈر سے اپنی کھچڑی داڑھی کو کھجلایا۔ اس کی پگڑی کھل کر اس کے کندھوں پر پڑی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس لے کر پگڑی باندھنا شروع کردی۔

بیکا حسبِ معمول زور سے گاتا ہوا آ رہا تھا ــ" زمانہ یہ سمجھا کہ ہم پی کے آئے۔"

" ارے بھوتنی کے ــ" دروازے سے داخل ہوتے ہی بیکے کو ہرچرن سنگھ کی گالیاں سُننی پڑیں "سینما دیکھ کر آ رہا ہے کیا؟ سالے ماں دربدر بھیک مانگتی ہے اور تو دیکھتا ہے سینما۔"

بنسی لال نے گانا بند کر کے اندر سے آواز دی ــ" دارجی ــ سالا دارو پی کے آیا ہوگا۔"

بیکا کلدیپ آرٹسٹ کی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔" دارجی، میں نے کہا۔ سالی اتنی ردی فلم تھی کہ ہیف ٹیم میں ہی اٹھ آنا پڑا۔ سوا پانچ روپے بیکار گئے۔ لیکن تم ــ دارجی، تم آج اکیلے بیٹھے ہو؟"

مشین بند کر کے رام سنگھ باہر نکل آیا۔" پرنٹ آرڈر، ہرچرن سینہا۔"

ہرچرن سنگھ نے پگڑی بالکل کھول دی۔ اس کے پسینے سے گیلے بال بکھر گئے۔ زیرِ لب اکھبس لے کہا " یہ کیس سالے تو ٹھیک ہی نہیں ہوتے اور یہ پگڑی تو ایسی بھوتنی ہے کہ ــ" اسے مذاق سوجھ گیا ــ" جیسے سالی پریتو! ادھر سے اُدھر لڑھک جائے، بس میں نہ آئے۔!"

پریتو کا نام لیتے ہی رام سنگھ مشین مین اور بیکے کی ہنسی بکھر گئی۔ رام سنگھ نے پیٹ سے نیچے کھسکتے ہوئے تہمد کو پھر پیٹ پر چڑھا لیا۔ سینے کے گھنے بالوں کو کھجلایا اور جب اس کے ناخن پسینے میں ڈوب گئے تو انھیں ہرچرن سنگھ کے میلے میز پوش پر مل دیا۔

بیکے نے اپنے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا ــ" دارجی! سالی کو بس میں کرنا۔؟"

ہرچرن سنگھ بولا۔" آج تک تمھیں یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ اسے بس میں کرنا آسان نہیں ہے ارے ماں کے جائے! چھوٹا سردار پردیپ ہزار جتن کر کے ہار گیا۔ سینکڑوں روپے برباد کر دیے پر وہ قابو میں نہ آئی۔ اسے تو بس ایک لڑکا پیارا لگتا ہے، بنسی لال، ہندی کمپوزیٹر ــ جو اس سے بے پروا اندر شیڈ میں کھڑا کام کرتے ہوئے گا رہا ہے۔"

بیکے کے کانوں میں اندر سے آتی ہوئی آواز کے بول پڑے ۔ بنسی لال گا رہا تھا۔

بنجاں پیراں تو رانجھے نے یاد کیتا جدوں ہیر سنیہڑا گھلیا اے
ماں باپ قاضی سبھی گرو ہوئے گل سنیہاں دا سر تے جھلیا اے

وہ جھنجھلا گیا۔ اس نے اپنی ٹانگیں بابو اندر راج کے خالی میز نما تختے پر رکھ دیں اور بولا "دار جی، مجھے سمجھ نہیں آتی کہ بنسی لال میں کیا چیز ہے؟ یہی نا کہ سالا ذرا خوب صورت ہے۔ دتی سے کریم منگا کر بال گھنگھریالے بنا لیے ہیں۔ بس اتنی سی بات پر مرتی ہے پریتو؟ اور ادھر چھوٹے سرکار کو دیکھو، پانسو روپے کا سوٹ، داڑھی میں فکسو لگی ہوئی پگڑی پٹیالا شاہی۔"

رام سنگھ پرنٹ آرڈر نے کر پھر اندر چلا گیا۔ اس کے میلے ناخنوں کے نشان میلے میز پوش کے کونے پر لگے ہوئے تھے۔

بیکے نے آنکھیں موند لیں۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ آخر بنسی لال میں کیا خوبی ہے جو پریتو اس پر مرتی ہے، اس کے پیچھے ماری ماری پھرتی ہے اور کسی دوسرے کو خاطر میں نہیں لاتی۔ بنسی لال کے پاس پیسہ بھی نہیں ہے۔ ہاں اچھے صاف ستھرے کپڑے ضرور پہنتا ہے۔ بال گھنگھریالے ہیں اور رنگ ذرا گورا ہے ـــــ اور سالا بازار میں نکلے تو لوگ اسے کالج کا لونڈا سمجھتے ہیں ـــــ بڑا آیا ہے سول سرجن کا لڑکا ـــــ!

بیکے کے لیے سب سے بڑا افسر سول سرجن ہی تھا ـــ ڈی سی۔ ایس پی اس کے نزدیک بے معنی لفظ تھے۔

ہرچرن سنگھ پگڑی باندھتے باندھتے چونک اٹھا۔ پریس کے دروازے پر ایک شخص آ کر چلا گیا تھا۔ وہ بری طرح سہم گیا۔ اگر فیکٹری انسپکٹر ہوا تو؟ اس نے جلدی سے چھٹی جماعت کی ٹرانسلیشن کے پروف سمیٹ کر ٹوکری میں رکھ دیے "کمبخت کھل کھل جاتی ہے ـــ" اس نے دل میں پگڑی کو کوستے ہوئے کہا اور پھر بیکے کو ٹھوکا دے کر ہوشیار کر دیا۔

بیکا ایک دم اچھل پڑا۔ پھر سرگوشی میں بولا "دار جی! کرپا رام کا دروازہ کھلا ہے" اس نے باہر اندھیرے میں اشارہ کیا۔ گلی کے پار کرپا رام پوسٹ مین کا دروازہ نیم وا تھا ـــ ہرچرن سنگھ کی حیرت دوچند ہو گئی۔ کیونکہ اس نے ابھی کچھ دیر پہلے یہی دروازہ بالکل بند دیکھا تھا۔

بیکا پھر بولا۔ "مہابیر کی سوگند، دارجی! سالی پر بتو باہر آئی ہے۔ بنسی لال سے ملنے کے لیے۔ اس کے چھٹی کرنے کا وقت ہو رہا ہے نا؟"

ہرچرن سنگھ کی حیرت دُور نہ ہوئی۔ اس نے کہا اور اگر کرپا رام ہوا تو؟"

بیکا نے آنکھیں گھمانا شروع کر دیں۔ پھر ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ "دارجی! شرط کی بات ہے کرپا رام کو تو رتوندا آتا ہے۔ اسے رات کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ تو افیون کھا کر بالکل بے ہوش پڑا ہو گا!"

آخری کمرے سے سرکلر شین کی کھڑکھڑاہٹ پھر شروع ہو گئی تھی۔ رام سنگھ پوسٹر چھاپنے میں مصروف تھا۔ پچاس ہزار کی داب تھی۔ بڑا کام تھا، مالکوں کی اندھی کمائی تھی۔ بنسی لال کی آواز میں تھکاوٹ آ گئی تھی۔ اب وہ گا رہا تھا:

رانجھے آکھیا، آؤ بیٹھ
کائی نیک تدبیر بنائیے نی

ہرچرن سنگھ نے پھر گھڑی کی جانب دیکھا۔ گیارہ بج کر بیس منٹ ہو گئے تھے۔ بنسی لال کا فارم مکمل ہونے والا ہو گا۔ اس نے شیڈ میں بجنے والی گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھا۔

بنسی لال کی آواز بند ہو گئی۔ ایک منٹ میں ہی وہ کمرے میں آ گیا۔

"بنسی! کتنی دیر ہے؟"

"دارجی! میں گیلیاں جوڑ رہا ہوں!" بنسی لال نے جواب دیا اور واپس جانے کے لیے مڑا۔ اسی وقت بیکا پھر چونک پڑا۔ پریس کے دروازے پر ایک سایہ آ کر چلا گیا تھا۔ اس نے ہرچرن سنگھ کو ٹھوکا دیا۔ ہرچرن سنگھ گھبراہٹ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "آئیے آئیے انسپکٹر صاحب!"

لیکن دروازے پر کوئی نہیں تھا اور چند ثانیے گھبراہٹ کے بعد بنسی لال زور سے ہنسا۔

"دارجی! آپ کو نیند آ رہی ہے۔ اس لیے فیکٹری انسپکٹر کے خواب دکھائی دیتے ہیں۔!"

"بنسی! تم اب چھٹی کرو۔" ہرچرن سنگھ نے بڑے معنی خیز انداز سے کہا۔ "کوئی تمھارا انتظار کر رہا ہے۔!"

بیکا کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دل ایک لمحے کے لیے رُک گیا ہو اور پھر زور زور سے

دھڑکنے لگا ہو۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "بنسی! تمھاری قسمت تیز ہے!"

وہ مسکرایا، پھر سر کے بالوں کو ایک جھٹکے سے درست کرتا ہوا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بنسی لال میلے کپڑے اتار کر اور صاف پتلون بش شرٹ پہن کر اندر سے نکلا۔ بیکا اپنی جیب سے سستی سی کنگھی نکال کر اپنے بال سنوار رہا تھا۔ بنسی لال نے اس کے ہاتھ سے کنگھی لے لی اور اپنے گھنگھریالے بالوں کو سنوارنے لگا۔ وہ مردانہ حسن کا بہترین نمونہ تھا اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ کرپارام پوسٹ مین جوان چلبلی اور خوبصورت لڑکی اس پر مرتی تھی۔ اسے احساس تھا کہ سب کمپوزیٹر، مشین مین اور دفتری خانے والے اس سے جلتے ہیں۔ بیٹھ پیچھے اسے کوستے بھی ہیں۔ ایک دفعہ تو اس نے کلدیپ آرٹسٹ کی زبانی یہ بھی سنا تھا کہ ادھیڑ عمر بابو اندر راج اس کی خوب صورتی کا سخت دشمن ہے۔ شاید اس لیے کہ ایک بار اس نے بھی اندھیرے میں پریتو کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش پر اس کے چلبلے ہاتھوں سے مکے کھائے تھے۔ وہ کھڑا کھڑا زیر لب مسکرانے لگا۔

اس نے مڑتے ہوئے گلی کی جانب دیکھا۔ کرپارام کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور پریتو دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ زیر لب سیٹی بجانے لگا۔ پھر ہرچرن سنگھ سے ہاتھ ملا کر اور بیکا کے کندھوں کو تھپتھپا کر باہر نکل آیا۔ نکلتے ہوئے اس نے معنی خیز انداز سے پریس کا باہر والا دروازہ بند کر دیا۔ اب بیکا ہرچرن سنگھ کی نظریں باہر نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

بیکا نے فوراً کہا۔ "دارجی۔ یہ سالا انداج بالکل ماسو کا نہ ہے!"

ہرچرن سنگھ چونک پڑا۔ "کمبخت کہیں کے۔ تجھے درد ہوتا ہے۔؟"

بیکا کا منہ پھٹ تھا۔ اس نے دل پر اپنا ہاتھ رکھا اور ایسے بولا جیسے اسٹیج پر ڈائیلاگ کہہ رہا ہو۔ "ہاں دارجی۔" اس نے کہا۔ "جب درد ہوتا ہے تو سینہ پھٹتا ہے۔ جب سینہ پھٹتا ہے تو دنیا دیکھتی ہے۔ اس بھید کا راج آکھر دنیا سے کس طرح چھپاؤں۔ ادھر بھی مجبوری، ادھر بھی مجبوری ــــ"

پھر وہ ہرچرن سنگھ کے جھانپڑ سے بچنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ "دیکھوں تو سالے جاتے کہاں ہیں۔"

رام سنگھ نے مشین کی گھڑگھڑاہٹ سے بلند آواز میں کہا۔

"ہرچرنیا! ذرا اندر آنا؟"

بیکا ہرچرن سنگھ کی پروا کیے بغیر باہر نکل آیا۔ اب کرپارام کا دروازہ بند تھا۔ پریس کا دروازہ کھلنے سے باہر تھوڑی سی روشنی پھیل گئی۔ گلی کے آخری کنارے پر میونسپلٹی کا بلب چمک رہا تھا۔ بیکا چند ثانیے بالکل ساکت کھڑا انتظار رہا۔ اسے کہیں سے بھی کوئی آواز سنائی نہ دی۔ تب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کرپارام کے دروازے تک گیا۔

اس نے سنا پریتو کہہ رہی تھی :" بنسی! میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔ جس پنساری سے میری بات پکی ہو رہی ہے وہ چالیس برس کا ہے۔ بنسی! تم مجھے بھگا کیوں نہیں لے جاتے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔!"

ہر رات یونہی ہوتا تھا ــــ

بنسی لال کی رات کی شفٹ ہوتی تو پریتو رات کے اندھیرے میں گلی میں ٹھہر کر اس کا انتظار کرتی۔ پریس کے سب ملازموں کو یہ بات معلوم تھی۔ ہرچرن سنگھ اور بیکا اس معاملے میں سب سے ہوشیار تھے۔ وہ گلی میں دبے پاؤں چلنے کی ہلکی سی آواز سن کر اندازہ لگا لیتے کہ پریتو بے تابی سے بنسی لال کی راہ دیکھ رہی ہے۔ کئی بار یوں ہوتا کہ شرارت کے طور پر بیکا پریس کا دروازہ کھول کر باہر نکل آتا اور بنسی لال کی سی آواز بنا کر مصنوعی انداز میں کہتا۔

" اچھا منیجر صاحب! جے سیتا رام!"

اور جب وہ کرپارام کے مکان کی اندھیری آڑ میں پاؤں پٹخنے کی آواز سنتا تو کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ ایسے موقعوں پر ہرچرن سنگھ کی گئی ہوئی جوانی لوٹ آتی اور وہ اندر سے پکارتا۔

" اندر آ بے بھوتنی کے!"

تب بیکا اندر آ کر کلدیپ آرٹسٹ کی خالی کرسی پر بیٹھ جاتا اور ایک سرد آہ بھر کر بے ڈھنگے پن سے کہتا :" دار جی! چاہے سالی منسی لال کے ساتھ بھاگ جائے، چاہے اس سے شادی کرلے۔ دونوں ایکٹر ایکٹرس بن جائیں، پر اپنی محبت پکی ہے۔ ساری عمر بیاہ نہیں کریں گے۔"

" تمھیں دیتا کون ہے اپنی لڑکی۔" یہ آواز کاتب بابو اندر راج کی ہوتی جو پروفوں پر سوئے ہوئے

جاگ پڑتے۔

بیکا ادھر متوجہ ہو کر بُرا سا مُنہ بناتا "تم سوئے رہو پنڈت جی! یہ بچوں کی بات ہے، بزرگ نہیں بولا کرتے۔" اور پھر ہرچرن کو مخاطب کر کے کہتا "دار جی! کل کلدیپ آرٹسٹ کو کہا تھا۔ سالے روز بچوں کی کتابوں کے لیے چڑیاں، مرغ، لومڑیاں اور بھیڑیے کی تصویریں بناتا ہے، کبھی اس گلفام کی تصویر بھی بنا دے۔ پریتو کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے۔"

یہ کہتے کہتے بیکا کے ہونٹوں سے رال ٹپک پڑتی۔ موٹے پپڑیاں جمے ہونٹ سے پھسلتی ہوئی رال کو وہ زور لگا کر واپس کھینچ لیتا اور پھر گانے لگتا:

یا اللہ یا اللہ دل لے گئی

جتنی دیر باہر ڈیوڑھی میں ہرچرن سنگھ اور بیکا۔ بنسی لال اور پریتو کی باتیں کرتے رہتے۔ بنسی لال کمپوزیٹر کے شیڈ میں کھڑا اُگتا رہتا۔ وہ میٹرک فیل تھا۔ اس کی ماہانہ کمائی صرف پچھتر روپے کے قریب تھی۔ جن میں سے پچاس وہ ماں کو روٹی کے خرچ کے لیے دے دیا کرتا اور بقیہ پچیس میں اپنے کپڑوں، بوٹ کریم اور تیل وغیرہ کا خرچ چلاتا۔

بیکا ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ پریتو کے تئیں اس کی "محبت" زیادہ مضبوط ہے یا بنسی کے تئیں دوستی۔ کبھی کبھی وہ پریتو کے ساتھ اپنا تصور کرتا تو عجیب بے ڈھنگے سے خیالات آتے۔ پریتو سالی بے انتہا خوب صورت ہے، وہ دل میں کہتا اور وہ ــــ وہ ــــ لیکن وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ احساسِ کمتری کے باوجود پریتو کے لیے بڑی خواہش رکھتا تھا۔ ایسی ہی خواہش، جو ایک ٹائیفائڈ کا مریض کراہے اور نمکین بنے ہوئے گوشت کے لیے رکھتا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ گوشت اسے راس نہیں آئے گا۔

ہرچرن سنگھ خود ایک سربستہ راز تھا۔ اس کے بارے میں مختلف باتیں مشہور تھیں لیکن اس نے آج تک اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا تھا۔ حتیٰ کہ وہ کسی دوست کو بھی اپنے گھر نہیں لے گیا تھا۔ اس کی مونچھوں کے پیچھے چھپی ہوئی مسکراہٹ البتہ اس بات کی غمازی کرتی تھی کہ وہ بھی پریتو میں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر مُسکراتا۔ خون کی ایک گرم لہر اس کی رگوں میں رینگ جاتی اور وہ پگڑی کھول دیتا۔ پھر پسینے سے تر بتر بالوں پر باندھتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑاتا۔

"ٹھیک ہی نہیں ہوتی کُھل کُھل جاتی ہے۔!"

بابو اِندر راج کا انداز ان سب سے مختلف تھا۔ وہ بہت خاموش طبیعت کا آدمی تھا۔ باتونی نہ ہونے کی وجہ سے لوگ اسے خطرناک سمجھتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہ مالک کا جاسوس ہے اور پریس کی بات اسی کے ذریعے مالک کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ پریتو کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ وہ شاید بدچلن ہے اور اسی غلط فہمی کے زیرِ اثر اس نے اندھیرے میں آکر اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرنے پر اس کے چلبلے ہاتھوں سے اپنی ناک پر مکّے کھائے تھے لیکن وہ اس بات کا اظہار کبھی نہ کرتا تھا۔

کلدیپ آرٹسٹ، رام سنگھ مشین مین اور گڑھوالی کمپوزیٹر سب پریتو پر مرتے تھے، کھلے بندوں اس بات کا اقرار کرتے تھے، لیکن کلدیپ آرٹسٹ اور بنسی لال میں گاڑھی چھنتی تھی۔ اسی لیے تو بنسی لال کے سب راز کلدیپ آرٹسٹ کو معلوم تھے ـــ اور بیکا تو یہاں تک کہتا تھا کہ بنسی لال نے پریتو کی ایک بڑی خوب صورت تصویر لاکر کلدیپ کو دی ہے کہ وہ اس کا پنسل اسکیچ بنادے۔

اس رات جب بیکے نے کرپارام کی ڈیوڑھی میں انھیں باتیں کرتے سنا، تو بات ایک نیا رُخ بدل چکی تھی۔ اپنی بیٹی کے تئیں کرپارام کا رویہ تبدیل ہوچکا تھا۔ لوک لاج پر اس کی پدرانہ شفقت قربان چڑھ چکی تھی۔ پریتو، پریس ملازموں کے گندے آوازوں، فحش فقروں، گلی محلّے والوں کی باتوں سے بہت زیادہ بدنام ہوچکی تھی۔ باپ بیٹی کا گزارہ ڈاک خانے کی بارہ روپے ماہانہ پنشن اور پچیس روپے ماہانہ مکان کے کرائے پر منحصر تھا۔ افیون کا خرچ نہیں نکلتا تھا اور ابھی اتنی عمر پڑی تھی۔ کرپارام نے تنگ آکر ایک تیر سے دو شکار کرنے چاہے۔ پریتو کا بیاہ بھی ہوجائے گا اور دو تین ہزار نقد بھی مل جائے گا۔ اس لیے اس نے رام آسرے پنساری کی بات مان لی تھی۔ اس نے گلی محلّے میں کہنا شروع کردیا تھا کہ اس کی لڑکی اب پھاگن آتے ہی دلہن بن جائے گی۔ بیٹی کا اصلی گھر تو سسرال ہوتا ہے۔ آخر کب تک ماں باپ سنبھالے رکھیں۔

اور بنسی لال مجبور تھا۔ اس کے پاس پچاس روپے نقد بھی نہیں تھے کہ پریتو کو بھگانے کے لیے کسی بڑے شہر کا کرایہ ہی بنا سکتا۔ پھر بھی اس نے پریتو سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کچھ پیسے جمع کرنے کی کوشش کررہا ہے اور ہاتھوں میں سو دو سو روپے آتے ہی اسے بھگالے جائے گا۔

دِلّی جاکر وہ باقاعدہ کچہری میں شادی کرلیں گے ..... اور پھر بنسی لال کو کسی نہ کسی پریس میں کام مل جائے گا۔ کرپارام کا کیا ہے، دو چار روز رو دھو کر ٹھنڈا ہو جائے گا اور اسی رشتے کو قبول کرے گا لیکن پریتو جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہوگا۔ کرپارام انھیں تلاش کروانے کی بے حد کوشش کرے گا کیوں کہ دو تین ہزار روپے بہت بڑی چیز ہیں، اور بیٹی کا کیا ہے۔ اس کا بیاہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی ہے۔

اس دن سے بنسی لال کی پوشاک، رہن سہن کا ڈھنگ، سب کچھ بدل گیا۔ اس نے سَر میں قیمتی کیسٹر آئیل ڈالنا چھوڑ دیا۔ کریم کو خیر باد کہہ دیا۔ ہر ماہ جو ایک دو نئے جوڑے سلواتا تھا، بند کر دیے۔ بوٹوں کے ساتھ جرابیں پہننا تیاگ دیا۔ اب اس کے بوٹ بنا پالش کے رہنے لگے، اس کے چہرے کی ہنسی معدوم ہوگئی۔ اس کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔ گہری اور گمبھیر سنجیدگی وہ اب بھی گایا کرتا تھا لیکن اس میں وہ خوشی نہ تھی۔ وہ ہنسی نہ تھی۔ اب وہ گیت کے صرف وہی بول چھیڑتا جن میں ہجر کی تلخی کا ذکر ہوتا، زمانے کی زیادتیوں کا رونا ہوتا ــــ دنیا کے ظلم کی بات ہوتی۔

پریس میں اس بات کے چرچے ہوئے۔ کلدیپ آرٹسٹ کے سوائے کسی کو اس حقیقت کا علم نہیں تھا۔ بیکا کو بھی کچھ نہ کچھ حقیقت معلوم تھی لیکن اس نے بھی خاموشی اختیار کرلی۔ پریس کے مالک نے بھی ایک دو بار بنسی لال سے مذاق میں اس تبدیلی کا باعث پوچھا، مگر وہ ٹال گیا۔ دیگر لوگوں نے یہ سمجھا کہ بنسی لال کا سب بناؤ سنگار پریتو کے لیے ہی مخصوص تھا، اور اب شاید ادھر سے ٹکا سا جواب ملنے پر ہی اس کی عادت اور رہن سہن میں فرق آگیا ہے۔

بیکا نے رات کے اکیلے پن میں اپنے شبہات کو ظاہر کیا۔ بنسی لال اس رات کام پر نہیں تھا۔ اس نے ہرچرن سنگھ سے کہا" دار جی! مجھے معلوم ہوتا ہے، جیسے کرپارام کی کچھ شرارت ہے۔ وہ پریتو کا سودا کرنا چاہتا ہے۔"

"ہُنھ!" ہرچرن سنگھ نے مونچھوں کے بال مروڑ کر دانت میں دیتے ہوئے کہا۔

"بنسی لال بڑا سیانا ہے، لیکن بے وقوف ہے۔" بیکا پھر بولا۔" وہ پریتو سالی کو بھگا کیوں نہیں لے جاتا۔ میں حیران ہوں، آخر وہ دیر کاہے کو کر رہا ہے؟"

"ابے کمبخت کہیں کے!" ہرچرن سنگھ بولا ــ "بھگنے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بنسی لال کونسا نواب ہے۔؟"

بیکا ایک آہ بھر کر رہ گیا۔ بولا "ہائے گرمی!"

"بابو اندر راج نے حسبِ معمول سوتے سوتے چونک کر کہا "اگر پریتو کا سودا ہو گیا ہے تو وہ جان دے دے گی اور بنسی لال بھی مر جائے گا۔ کئی گھر اجڑیں گے۔"

رام سنگھ اور شام سنگھ مشین مین باہر نکل آئے۔ رام سنگھ بولا "یہ ناانصافی ہے۔ اگر بنسی لال نے خود کچھ نہ کیا تو میں پریتو کو زبردستی اٹھا کر لے جاؤں گا۔ سات سال نہیں! پر چھ ماہ قابو میں نہیں آؤں گا۔ گرہست آشرم میں رہوں گا!"

ہنس پڑے لیکن بیکا کو برا محسوس ہوا اس نے دھیرے سے کہا "یہ ڈاکہ ہے، یاروں کی یاری پر ڈاکہ ہے۔ بنسی لال تم سب کا یار ہے اور اس کی ہونے والی بیوی تم سب کی۔"

"بیوی ہے۔ کیوں ہے نا بھوتنی کے؟" ہرچرن سنگھ نے ٹھوکا دیا۔

بیکا اور سنجیدہ ہو گیا "دارجی! تم سب لوگ گندے ہو۔" وہ جھاپڑ سے بچنے کے لیے ذرا پرے ہو گیا لیکن سنجیدگی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا "بنسی لال پریتو سے پریم کرتا ہے۔ میں بھی پریتو سے عشق کرتا ہوں۔ مہابیر جی کی سوگند۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں، لیکن میں اتنا برا نہیں ہوں۔ بنسی لال میرا یار ہے۔ اس کا حق ہے پریتو پر۔ تم سب لوگ کتنا گندہ سوچتے ہو! شرم کرو۔!"

رام سنگھ کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ کل کا چھوکرا، تیس روپے ماہوار پانے والا۔ ان سب کی بے عزتی کر گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیکا کو پکڑ کر نیچے گرا لیا اور دو چار لاتیں جما دیں۔

سب خاموشی سے دیکھتے رہے۔

بیکا کی ناک سے خون بہنے لگا۔ اس نے آستین سے اسے پونچھ ڈالا اور بولا "تم سب لوگ سالے بہت برے ہو، بہت برے۔ بنسی لال کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس کے پاس دِلی تک جانے کا کرایہ بھی نہیں ہے۔ اور اس کی پریتو بِک رہی ہے، اور تم لوگ یہ باتیں کر رہے ہو۔ میں چاہے بھوکا رہوں مگر اب کے آدھی تنخواہ بنسی کے حوالے کر دوں گا۔"

وہ سسکتا ہوا باہر چلا گیا۔

ایسے محسوس ہوا جیسے بیکا سب کے ضمیروں پر ہتھوڑے سے ایک کاری ضرب لگا گیا ہو۔ سب لوگ چپ چاپ اپنے اپنے کاموں میں جُٹ گئے۔ ہرچرن سنگھ نے پراسرار مسکراہٹ سے صرف اتنا

کہا۔" کل تنخواہ ملے گی۔!"

بابو اِندر راج بولا۔" ہاں، کل تنخواہ ملے گی اور مجھے اپنی لڑکی کے انجکشن لے جانے ہیں۔"

دوسرے دن بیکا کو تنخواہ ملی تو وہ شام کے وقت بنسی کے گھر گیا۔ راستے میں اسے رام سنگھ، اِندر راج، کلدیپ آرٹسٹ اور ہرچرن سِنگھ اسی راستے سے واپس آتے ملے۔ ان کے چہروں پر بڑی عجیب روشنی تھی۔

اس نے جاتے ہی پندرہ روپے بنسی لال کے سامنے پھینک دیے اور کہا۔" بنسی، لے! پرسیتو سے کرلے شادی۔ کرلے سالے! ابھی وقت ہے۔"

بنسی لال نے مسکرا کر فرش پر اشارہ کیا۔ فرش پر کئی نوٹ بکھرے پڑے تھے۔ بولا۔" پنڈت اندر راج نے اپنی لڑکی کے لیے انجکشن لانے تھے.... رام سنگھ کے پاس بُوٹ نہیں تھے۔ ہرچرن اور کلدیپ آرٹسٹ کے پاس بچّوں کی فیس نہیں تھی، لیکن وہ سب پچیس پچیس روپے دے گئے ہیں۔ بیکے پیارے، تم سب کتنے اچھے ہو!" اور اس نے اسے گلے سے لگا لیا۔

○○

خلیج اور پُل

پیچھے سے پھر کسی نے بلی جیسی خرخر کی آواز نکالی۔ اب وہ برداشت نہ کر سکا۔ وہ اپنے پاؤں پر اس طرح آہستہ آہستہ گھوما کہ بلیک بورڈ سے اس کا چہرہ دروازے کی طرف اور دروازے سے جماعت کی طرف جاتے ہوئے پورا ایک منٹ لگا۔ ڈسکوں کی درمیانی قطار میں بھولا بھالا شریف سا چہرہ بہت جرأت سے اس کی طرف دیکھتا نظر آیا۔ باقی سبھی لڑکوں کی نظریں اپنے اپنے ڈسکوں پر جمی تھیں۔ اس کی نگاہوں نے بے باکی، ہشیاری اور خود یقینی سے جماعت کا طواف کیا۔ سب لڑکے نہایت شریف اور خاموش الطبع اور بھولے بھالے نظر آرہے تھے، لیکن پھر بھی اُسے شک ہوا کہ دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید اس کے چہرے سے اپنی شرارت کا ردِ عمل جاننا چاہتے ہیں۔

بائیں ہاتھ کی قطار سے آخری ڈسک پر چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور چھدرائے بالوں والا دیوقد لڑکا ایک ٹانگ ڈسک سے باہر نکالے عادتاً اُسے ہلا رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ پٹھانی واسکٹ کی جیبوں میں تھے۔ ماسٹر نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُسی لمحے اس نے بھی آنکھیں اُٹھائیں۔ اُس کی ٹانگ ہلنی بند ہو گئی۔ اُس نے کوٹ کی جیبوں سے ہاتھ باہر نکال لیے اور سکڑ کر بیٹھ گیا۔ ماسٹر نے ایک لمبا سانس لیا اور بلیک بورڈ کی طرف پھر مڑ آیا۔

"دسویں جماعت کا سیکشن بی..... آج آپ پہلی بار وہاں پڑھانے جا رہے ہیں۔ مسٹر گربانی۔"
اُس کے ذہن میں شاید پچاسویں بار ہیڈ ماسٹر کے الفاظ گونج اُٹھے..... "یہ سیکشن ہمارے اسکول کی پیشانی پر بدنما داغ ہے۔ کوئی اُستاد وہاں آرام سے نہیں پڑھا سکتا۔ شور مچانا، آوازے کسنا، ماسٹروں کو تنگ کرنا یہ اُن لوگوں کا مشغلہ ہے۔ کوشش کے باوجود ہمیں یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ ان شرارتی لڑکوں کا لیڈر کون ہے۔ ہم نے کوشش کر کے اس سیکشن کے آدھے سے زیادہ لڑکے دوسرے سیکشنوں میں تبدیل کر دیے اور نئے لڑکے وہاں بھیج دیے، لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ آپ اپنے تجربے، اپنی شخصیت اور اپنی کامن سینس سے انھیں راہ پر لے آئیے... ممکن ہو تو سزا نہ دیں۔ آپ اسکول میں نئے ہیں اور سبھی طلبا امیر پٹھان یا پنجابی جاٹ گھروں کے ہیں، چاقو وغیرہ ہمیشہ پاس رکھتے ہیں۔ اس لیے کہہ رہا ہوں۔" — اور اب وہ جماعت میں تھا۔

پاکستان کے صوبہ سرحد کے اس قصبے میں صرف ایک ہی اسکول تھا۔ اس نے اسکول میں قدم رکھتے ہی قدآور اور جسیم لڑکے دیکھے تھے۔ بڑے ڈیل ڈول والے یہ لڑکے غالباً عمر کے اس حصے میں تھے جہاں انھیں کالج کی پوسٹ گریجویٹ جماعتوں میں ہونا چاہیے تھا لیکن اُسے علم تھا کہ غیور پٹھان اپنے لڑکوں کو دس برس سے کم عمر میں اسکولوں میں داخل نہیں کرواتے اور جاگیردار گھرانوں کے لڑکے تو ایک ایک جماعت دو دو تین تین برسوں میں بھی پاس کر لیں تو بڑی بات سمجھی جاتی ہے۔ اُن کے چہروں پر صحت کی سُرخی تھی اور دیو قد ہونے کے باوجود اُن کی آنکھوں سے ایک معصوم رُوح جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ وہ خالص پشتو میں بات کرتے کرتے اُسے دیکھتے ہی ایک دَم رُک جاتے اور اُس کے لیے راستہ بناتے ہوئے دائیں بائیں دو قطاروں میں کھڑے ہو جاتے۔ ہیڈ ماسٹر کے دفتر تک پہنچتے پہنچتے لگ بھگ سبھی طلبا نے اُسے دیکھ لیا تھا اور اس نے انھیں آپس میں کانا پھوسی کرتے ہوئے بھی سُن لیا تھا۔ "خو ہمارا نیا ماسٹر ہے۔ حساب اور جیومیٹری پڑھائے گا۔!"

"نیا ماسٹر! استا پا کس وموروغیم!" ایک لڑکے نے پشتو میں گالی دی۔ وہ رُک گیا۔ لڑکے نے شاید یہ سمجھا تھا کہ وہ پشتو سے نابلد محض ہے لیکن اُسے رُکتے دیکھ کر گالی دینے والا لڑکا باقی لڑکوں کی بھیڑ میں تحلیل ہو گیا۔

اور اب وہ جماعت میں تھا۔

بلیک بورڈ پر جیومیٹری کی تھیوریم کی اُدھوری ڈرائنگ کو مکمل کرنے کے لیے اُس نے چاک اُٹھایا۔ ڈرائنگ کی دونوں تکونوں کو مکمل کرنے سے پہلے اس نے جماعت پر ایک گہری نظر ڈالی۔ کوئی چہرہ بھی بلیک بورڈ کی طرف اُٹھا ہوا نہیں تھا۔ سب اپنی ڈسکوں پر دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ ابھی تک اُن کی کتابیں بند تھیں۔ دائیں ہاتھ کی قطار کے چوتھے ڈسک پر بیٹھا ہوا لڑکا جلدی جلدی ایک کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھ رہا تھا۔

"یُو...... !" اُس نے سنبھلی ہوئی اور بارعب آواز میں کہا۔ "تم.... چوتھے ڈسک والے۔ تم کھڑے ہو جاؤ۔"

سب لڑکوں کی نگاہیں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ اُس کی آنکھوں کے کونوں سے سرکتی ہوئی دُزدیدہ نگاہ نے اُسے بتایا کہ کچھ لڑکے ہونٹوں میں ہی مُسکرا رہے تھے۔

لڑکا کھڑا ہو گیا۔ پنسل اُس کے ہاتھ میں تھی۔ "کیا کر رہے تھے۔؟"

لڑکے نے بلیک بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معصومیت سے کہا۔ "آپ کی شکل نقل کر رہا تھا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے ان الفاظ کے گہرے معانی نہ سمجھ سکا اور بلیک بورڈ کی طرف دیکھنے لگا، لیکن وہ جلد ہی ذومعنی لفظ "شکل" کی اہمیت سمجھ گیا اور مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر اُس کے ہونٹوں پر کھنچ گئی، جو لڑکا اتنی نفاست سے زبان کا استعمال کر سکتا ہے یقیناً لائق ہے۔ اُس نے سوچا۔

مُسکرا کر اُس نے کہا۔ "سِٹ ڈاؤن۔"

یہ اس کا بارہا آزمودہ فارمولا تھا۔ شرارت کرنے والے لڑکے کو جھٹ سے جھوٹ بول دینے پر وہ سزا نہیں دیا کرتا تھا۔ لڑکا اب بیٹھ گیا تھا۔ اب اس کا اپنا موڈ بھی قدرے بہتر ہو چلا تھا، جو کشمکش اور فکر اُسے ہیڈ ماسٹر کے الفاظ کے بعد اور کلاس روم میں پہنچنے کے بعد ہوئی تھی وہ اب آہستہ آہستہ دور ہو چلی تھی۔ اُس نے سوچا آخر یہ بھی تو لڑکے ہی ہیں۔ جسم بڑا ہو جانے سے کیا ہوتا ہے دماغی طور پر تو ابھی بچے ہی ہیں، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ کا نام ماسٹر صاحب؟" ایک لڑکا دائیں طرف سے اُٹھا۔ وہ بالکل چھوٹا سا تھا۔ اس کا

سر مُنڈا ہوا تھا اور اُس پر پھندنے والی چھوٹی سی ٹوپی رکھی تھی۔ اس کی ناک سُرخ تھی اور گھنی بھوؤں کے نیچے دو چھوٹی چھوٹی شرارتی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "ہاں ماسٹر صاحب۔ آپ کا نام ؟" کئی لڑکوں نے ایک ساتھ کہا۔

ایک لمحے کے لیے اُسے کچھ نہ سُوجھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس لڑکے کے قریب پہنچا اور مسکرا کر اُس کے کندھوں کو تھپتھپایا۔ ٹھوڑی سے پکڑ کر اُس کے مُنہ کو اونچا کیا۔

"میرا نام جاننا چاہتے ہو؟"

لڑکا ڈر، غیر یقینی شک اور تردّد کے ساتھ اُسے دیکھتا رہا۔ کچھ پل دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے، آنکھوں سے آنکھیں باندھے کھڑے رہے۔ لڑکا اب ڈر سے کانپنے لگا تھا۔ سب لڑکوں کی نگاہیں نئے ماسٹر کی طرف تھیں۔ وہ دم بخود کسی جلدی سے ظہور پذیر ہونے والے واقعے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ پیچھے کی طرف مُڑ آیا۔

"میرا نام زیڈ۔ اے گُرباغ ہے۔ اور میں تمھارا نیا ٹیچر انچارج ہوں۔" اُس نے کہا۔

"زیڈ۔ اے سے کیا بنتا ہے ماسٹر صاحب؟" بھولی بھالی شکل والے لڑکے نے پوچھا۔

"ذوالفقار احمد۔" اُس نے جواب دیا۔

"ٹیچر انچارج کو انگلش میں کیسے بناتا ہے ماسٹر صاحب؟" خالص پٹھانی لہجے میں ایک آواز آئی۔ یہ آواز بیچ کی قطار سے چھٹے ڈسک پر بیٹھے ہوئے ایک سڈول لڑکے کی تھی جو اب کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بہت طاقتور دکھائی دیتا تھا۔ اس کی شلوار کے ٹخنے چڑھے ہوئے تھے، لیکن قمیص دھاری دار دو گھوڑے والی بوسکی کی تھی۔ جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی امیر گھرانے کا لڑکا ہے۔

"کیا مطلب؟" اُس نے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔۔ وہ اُن سے ڈرے گا نہیں، اُس نے تہیّہ کیا۔ وہ لمحہ نزدیک آ رہا ہے۔ جب ہمیشہ کے لیے اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا کہ وہ اُن سے پڑھنے کے لیے آیا ہے یا پڑھانے کے لیے۔

"ٹیچر انچارج کے انگریزی میں ہجے پوچھ رہا ہے سر۔" اس کے ساتھ بیٹھے دوسرے لڑکے نے وضاحت کی۔

"اوہ!" مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔ اس نے واپس مُڑ کر بلیک بورڈ پر اپنا نام

انگریزی میں لکھ دیا، لیکن ساتھ ہی کہا" یہ تو تمھیں اپنے دوسرے ماسٹر صاحب سے پوچھنا چاہیے تھا جو انگریزی پڑھاتے ہیں۔"

اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ اُس سے کھُل کر بات کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اُن کی آنکھوں میں اس کے لیے شک و شبہ، غیر یقینی اور بے اعتباری کے ملے جُلے جذبات تھے، جو کبھی کبھی نفرت میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ اس نے سوچا وہ ان سب پر یہ تجربہ کر کے دیکھے گا کہ کیا انسان دوستی اور برابری کے سلوک کے ساتھ انھیں بس میں کیا جا سکتا ہے۔

" پہلے دو پیریڈ میرے ہی ہیں۔" اس نے پھر اپنی کرسی کے پاس آکر انھیں مخاطب کیا" میں چاہتا ہوں کہ ہم سب ایک دوسرے کے ناموں سے واقف ہو جائیں۔ اب میں تمھاری حاضری لوں گا تاکہ تم سب کے نام مجھے معلوم ہو جائیں۔ کیوں ٹھیک ہے؟" اس کی نظریں اس لحیم شحیم لڑکے پر تھیں جس نے اُس سے ٹیچر انچارج کا سپیلنگ پوچھا تھا۔ وہ اسے ان لڑکوں کا سرغنہ سمجھ رہا تھا۔

لڑکا چُپ چاپ بُت کی طرح بیٹھا رہا۔ سب خاموش تھے۔ اس نے میز پر سے حاضری کا رجسٹر اُٹھایا۔ پھر اُس نے بیٹھنے سے پہلے کرسی پر ایک نظرِ غائر ڈالی۔ وہاں لمبے لمبے کانٹوں والے دس بارہ لسوڑے پڑے ہوئے تھے۔

وہ سمجھ گیا۔ یہ بھی اُسے تنگ کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ اگر وہ ان لسوڑوں پر بیٹھ جاتا تو اُن کے لیے ایک اچھا خاصا تماشہ بن جاتا۔ اس نے لسوڑے اُٹھا کر میز پر رکھ دیے لیکن پھر بھی بیٹھنے سے پہلے کرسی کو کھینچ کر دیکھا۔ اس کے چاروں پائے سلامت تھے۔ اُس نے نام پکارنے شروع کیے۔

"شریف محمد"

"یس سر۔"

" صاحب خان۔"

"یس سر۔"

" کالے خان"

" یس سر۔"

" اقبال احمد۔"

"یس سر۔"

ہر نام کے بعد وہ نظر اُٹھا کر جواب دینے والے کو دیکھتا اور ذہن میں اس کا نام محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا لیکن دس بارہ ناموں کے بعد ہی وہ اُکتا گیا۔ اُس نے سوچا پہلے دن ہی سب کچھ طے کر لینا ناممکن ہے۔ آہستہ آہستہ وہ ان سب سے واقف ہو جائے گا۔ اب وہ تیزی سے نام پکارنے لگ گیا۔" عزیز احمد۔"

"یس سر۔"

"عبدالصمد۔"

"نو سر۔"

یہ کون بدمعاش ہے، جو نو سر کہہ رہا ہے ـــــ اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ درمیان والی قطار میں بھولی بھالی شکل والا ننھا سا لڑکا کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے مرکوز تھیں اور چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔ شاید عبدالصمد اُسی کا نام تھا۔

"تم نے کہا ہے نو سر۔" اس نے پوچھا، لیکن اس کی آواز یکایک بھاری ہو گئی تھی۔

"نو سر۔" لڑکے نے پھر کہا۔

لڑکے کا چہرہ اب بھی جذبات سے عاری تھا۔ دائیں طرف کی قطار کے کچھ لڑکے مُنہ چھپائے ہنس رہے تھے۔ پیچھے کے ڈیسکوں سے کھُسر پُسر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ ایک دم خاموشی چھا گئی۔ وہ آگے بڑھا اور اُس چھوٹے لڑکے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

"نام ؟" اُس نے پوچھا۔

"عبدالصمد۔"

"نو سر کس نے کہا تھا ؟"

لڑکے پھر چپ تھے۔ وہ لوٹ آیا۔ اس بار وہ کرسی پر نہیں بیٹھا۔ چھوٹے لڑکے سے اُس نے کہا۔" بیٹھ جاؤ۔"

حاضری پھر شروع ہو گئی، لیکن اب اس کا موڈ بگڑ چکا تھا۔ اُس نے تیزی سے نام پکارنے شروع کر دیے:" غلام محمد۔"

"یس سر۔"

"شرف الدین۔"

"یس سر۔"

اس بار بڑا لڑکا بولا تھا۔ اُس نے یہ نام اپنے ذہن میں محفوظ رکھ لیا۔ "داشتہ آید بکار" اُس نے ہونٹوں میں ہی کہا۔ 'وہ اُسے قابو میں کرلے گا'، اُس نے سوچا۔ حاضری ختم ہوئی تو اُس نے پوچھا۔

"مانیٹر کون ہے؟"

پھر سب چُپ تھے۔

"ہُنھ۔" اُس نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ میرے پیریڈ کے لیے مانیٹر کا انتخاب تم سب کی مرضی سے ہو۔ تم کسی ایک کا نام پیش کرو۔"

لڑکوں کو اُس کی اس بات سے بے اعتباری کا احساس ہوا۔ نئے ماسٹر آتے ہی پہلے دن اپنا بیت توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ پہلے دن ہی ڈنڈے کے زور سے اپنا رعب بٹھاتے تھے۔ لیکن یہ ماسٹر صاحب مختلف تھے، ان کے طریقے بھی مختلف تھے۔ لڑکے بے اعتباری سے اُسے ماپنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

"شرف الدین ــــ!" لڑکا کھڑا ہو گیا۔ "شرف الدین کے مانیٹر بننے میں کسی کو اعتراض ہے؟"

خاموشی، مکمل خاموشی ــــ جیسے پوری جماعت کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ لڑکے بے اعتباری اور شک کے مِلے جُلے جذبات سے بھرے ہوئے تھے اور ماسٹر صاحب کی ہر کوشش کو شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ شرف الدین نے اس کی طرف دیکھ کر بھونڈے لہجے میں اَن پڑھ پٹھان کی طرح کہا۔

"اَم پہلے بھی مانیٹر تھا۔"

اس سے غلطی ہوئی۔ اس نے سوچا، لیکن اب تیر چل چکا تھا۔ غلطی ہو چکی تھی۔

"اچھی بات ہے۔" اس نے کہا۔ "اپنی ذمہ داری کو خوب ایمان داری سے نبھاؤ۔"

رجسٹر بند کر کے وہ پھر بلیک بورڈ کی طرف آ گیا۔ "تمھاری کتاب میں اس تھیورم کا نمبر ۲۱ ہے۔ اس تھیورم کی شکل میں سب سے پہلے ایک تکون اے، بی، سی سے مل کر بنی ہے۔ زاویہ بی نوے

ڈگری کا ہے۔"

"میاؤں۔!"

وہ پھر بھی تیزی سے مڑا نہیں۔ آہستہ سے مڑ کر چاک کو میز پر رکھ دیا اور پھر دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کر اور میز کا سہارا لے کر ٹیڑھا سا کھڑا ہو گیا۔ اسے علم تھا کہ اس کا نام گربائی ہے اور پشتو میں گربہ بلی کو کہتے ہیں۔ اس مناسبت سے اس کے نام کا مذاق اڑایا جانا ایک قدرتی فعل تھا۔

"شرف الدین، کون بولا تھا؟" اس نے مانیٹر سے پوچھا۔

"بلی سر۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"بلی؟ بلی کون؟"

"گربہ سر۔ ایک لڑکے کا نام ہے۔"

پیچھے بیٹھے لڑکوں میں سے کسی نے کہا۔ "گربائی!"

ایک قہقہہ پڑا۔

وہ سٹپٹا گیا، لیکن اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ تین چار قدم آگے بڑھ کر وہ اس ڈسک کے قریب کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے میاؤں کی آواز آئی تھی۔ ڈسک پر تین لڑکے تھے۔ اب تینوں بڑے معصوم سے دکھائی دے رہے تھے۔

"گربائی میرا نام ہے!" اس نے کہا۔ "کیا تمھیں یہ نام پسند نہیں ہے؟"

اب پھر خاموشی تھی ــــ لڑکے اس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ سب کی نظریں ڈسکوں پر جمی تھیں۔ استاد اور طلبا کے بیچوں بیچ ایک چوڑی خلیج تھی۔

انھیں اس پر اعتبار نہیں تھا۔

وہ اس خلیج کو بھر دے گا۔ اس نے فیصلہ کیا اور پھر بڑے پیار سے ان تینوں کے کندھوں کو تھپتھپایا۔ "اگر تمھیں یہ نام پسند نہیں ہے تو میں اور رکھ لیتا ہوں!" یہ کہہ کر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔

لیکن کسی نے بھی اس قہقہے میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ سب چپ تھے۔ بھرے ہوئے

کمرے کے لرزیدہ ماحول میں یہ قہقہہ ایسے گونجا، جیسے کھوکھلے ڈھول پر لات ماردی گئی ہو۔

وہ واپس چلتا ہوا شرف الدین کے ڈیسک کے پاس آکھڑا ہوا۔ "شرف الدین۔ میں چاہتا ہوں کہ آج صرف بات چیت ہی کی جائے۔ جیومیٹری کل کی جا سکتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے ؟"

شرف الدین کی تیوری چڑھی رہی۔ اُس نے کرخت لہجے میں کہا۔ "تم ٹیچر انچارج ہے۔"

وہ ششدر رہ گیا۔ شرف الدین چاہتا تو صاف اردو بول سکتا تھا، لیکن اُن پڑھ پٹھانوں کا سا لہجہ اختیار کرکے شاید وہ جتانا چاہتا تھا کہ ان دونوں میں کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔ اُس نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک دو منٹوں تک وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر یکا یک وہ پیچھے کی طرف مڑا۔ میز اور بلیک بورڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے دروازے تک آیا۔ جماعت کے سبھی لڑکے دَم بخود بیٹھے تھے۔ اُس نے دروازہ بند کرکے اندر سے کنڈی چڑھادی۔ اب وہ جس وقت مڑا تو اس کا چہرہ کرخت تھا۔ لڑکوں کے چہروں پر شک اور بے اعتباری کی لکیریں اور زیادہ گہری ہو گئی تھیں۔

اس نے کہا۔ "میں یہ تھیورم سمجھانے لگا ہوں۔ اگر آپ میں سے کسی نے اب کوئی شرارت کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ جب میں یہ سمجھا چکوں گا تو تمھیں یہ شکل اپنی کاپیوں میں اُتارنی ہوگی۔"

اپنے حکم کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے اس کی نظروں نے چہروں کا طواف کیا۔ شرف الدین ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرا رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کی قطار کی آخری رَو میں بیٹھا ہوا لڑکا اپنی ٹانگ پھیلا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ جیسے بھیڑیا اپنے شکار کو اپنے قابو میں دیکھ رہا ہو۔ وسط کی قطار والا بھولا بھالا لڑکا اب بھی دلیری سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اُس نے چاک لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ اُسی وقت اُس کے سر پر کچھ آکر لگا۔ بادام کا چھلکا تھا۔

"کون تھا؟" وہ گرجا۔

سناٹا چھا گیا۔ وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔ یکایک اُس کی نظر میز پر رکھے ہوئے رول پر پڑی۔ پھر اُسے ہیڈ ماسٹر کے لفظ یاد آگئے۔ اس نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈال لیے۔

اسی وقت پیریڈ کی گھنٹی بجی۔ حساب کا پیریڈ ختم۔ اُس نے سوچا اب اسے تواریخ پڑھانی ہوگی۔ لیکن سبجیکٹ اس کا اپنا ہی ہے۔ کیوں نہ وہ جیومیٹری ہی پڑھاتا رہے۔ اُس نے کہا۔

"کتاب بند نہ کرو۔ میں آج جیومیٹری ہی پڑھاؤں گا۔"

کھسر پُسر کی آوازیں آئیں تو شرف الدین نے کہا۔ "پیریڈ ہسٹری کا ہے، سر۔!"

"میں جانتا ہوں۔" اُس نے تیز آواز میں کہا۔ "لیکن میں جیومیٹری ہی پڑھاؤں گا۔"

"تم ٹیچر انچارج ہے۔" شرف الدین نے پھر ناخواندہ پٹھانوں کے سے لہجے میں کہا۔

اس نے چاک اُٹھالیا اور بلیک بورڈ کے پاس آکر لکھنے لگا۔ کسی نے بہت آہستہ سے آواز دی۔ "گربائی میاؤں۔"

"سامنے آؤ۔" اُس نے گرج کر کہا۔ "کون ہے سامنے آؤ۔"

پھر وہی خاموشی۔ کانپتی ہوئی خاموشی۔ جیسے ابھی ابھی بم پھٹ جائے گا۔

"شرف الدین۔ تم یہاں آکر کھڑے ہوجاؤ اور دیکھو کون شرارت کرتا ہے۔" اُس نے گھر کی چابی چور کے پاس امانت رکھنے میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔

شرف الدین آکر کھڑا ہوگیا۔

"سر، میں....." دائیں قطار کے بیچ میں سے کھڑے ہوکر ایک لڑکے نے دو انگلیاں سامنے کردیں، جس کا مطلب تھا کہ وہ پیشاب کرنے جانا چاہتا ہے۔

"نہیں، بیٹھ جاؤ ابھی!" اُس نے کہا۔

لڑکا بیٹھ گیا۔ کھسر پُسر پھر شروع ہوگئی۔ اب آخری ڈیسکوں پر کچھ لڑکے باتیں کر رہے تھے۔ اُس نے رول اُٹھا کر زور سے میز پر مارا۔ "خاموش!"

لیکن رول کی چوٹ سے میز پر رکھے لسوڑے اچھل پڑے اور اُن میں سے ایک اُس کے ناک پر آلگا۔ لسوڑے کی پتلی لجلجی اور لیسلی رس اس کے ناک پر چپک گئی۔

ایک قہقہہ بکھر پڑا۔

رومال سے ناک صاف کرتے ہوئے اُس نے لڑکوں کی طرف دیکھا، جو کھلے عام ہنس رہے تھے۔ اس کا غصہ قابو سے باہر ہوگیا۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ شرف الدین اب بھی ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرا رہا تھا۔

"سٹینڈ اپ۔" اُس نے دوہنستے ہوئے لڑکوں کو حکم دیا۔ "سٹینڈ اپ آن دا بنچ۔"

- دونوں لڑکے کھڑے ہوگئے۔ ایک بار پھر خاموشی چھاگئی۔

یکایک ایک لھسوڑا بلیک بورڈ پر آکر لگا۔ پھر دوسرا اُس کے بازو پر اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کئی لھسوڑے دائیں بائیں اور سامنے سے آئے اور بلیک بورڈ پر اپنی گوند چھوڑتے ہوئے بکھر گئے۔

چار لڑکے اس کی نظر میں تھے "باہر آجاؤ شیطانو!" اُس نے چاروں کو ڈسکوں کی قطاروں سے باہر نکال لیا "گیٹ آؤٹ" اس نے کمرے کا دروازہ خود کھول دیا۔
چاروں لڑکے چپکے سے باہر چلے گئے۔

"اب..... ؟" وہ زور سے بولا "اب اور کون کون تھے لھسوڑے پھینکنے والے؟ شرف الدین تم بتاؤ۔"

لیکن اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے آدھ منٹ جواب کا انتظار کیا۔ پھر اُس کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔ دونوں دم بہ خود ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ شرف الدین ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھر وہ بھاری قدموں سے چل کر بلیک بورڈ کی طرف آگیا۔

"سر، یس؟" دو انگلیاں سامنے کی طرف کیے ہوئے چھوٹا لڑکا پھر اُٹھا۔
وہ اُس کے قریب چلا گیا "کیا نام ہے تمہارا؟"
"بلی سر، گربہ...!"

ایک قہقہہ پھر پڑا۔ اب اُس سے برداشت نہ ہوسکا۔ اُس نے ایک بھرپور تھپڑ لڑکے کے رُخسار پر رسید کیا۔ لڑکا گرتے گرتے بچا۔

"بزدل!" اُسے کسی کا گرم سانس اپنی گردن پر محسوس ہوا "تُو چھوٹے لڑکوں کو مارتا ہے؟"

وہ یک دم مڑا۔ اس کا مدِ مقابل ٹانگ ہلانے والا لڑکا تھا، جسے اُس نے پہلے دو بار دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ اس کا قد چھ فٹ سے کچھ اوپر ہی ہوگا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ اس کے پیچھے پورے اطمینان سے کھڑا تھا۔ اس کے اپنے قد سے چار انچ اونچا۔ بازو کی مچھلیاں پھڑکتی ہوئیں، اس کے ہاتھ واسکٹ کی جیبوں میں تھے۔

ایک لمحے کے لیے دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پینتیس برس کا استاد اور سترہ برس کا طالب علم!

اس نے ہاتھ اٹھایا، لیکن لڑکے نے پہلا وار کیا۔ مکّہ اس کے کندھے پر پڑا اور وہ پیچھے ہٹتا ہوا دیوار کے ساتھ جا لگا۔

ایک قہقہہ پھر پڑا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے غصّے سے دھند چھا گئی۔ اب؟..... اب.....؟ اُسے جسمانی طور پر اس لڑکے سے نپٹنا پڑے گا۔ اس بے عزّتی کے بعد وہ ہیڈ ماسٹر کے الفاظ بھول گیا۔ لڑکا بلّی جیسی پھرتی کے ساتھ دوسرے وار کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے دیوار تھی۔ دائیں بائیں کے ڈسک خالی ہو چکے تھے اور جماعت کے سب لڑکے ایک طرف اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس نے دیکھا شرف الدین نے اٹھ کر کلاس روم کا دروازہ پھر اندر سے بند کر کے کنڈی چڑھا دی تھی اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرا رہا تھا۔

ایک دم وہ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ لڑکے پر جا پڑا۔ لڑکا پہلا وار صاف بچا گیا تھا اور وہ اپنے ہی زور میں ایک ڈسک سے جا ٹکرایا۔ اس کی کہنی میں قیامت کا درد اٹھا، لیکن اٹھ کر وہ پھر آگے بڑھا۔

اس کے وار کو لڑکے نے اپنے سینے پر سہا۔ لیکن وہ کافی طاقتور تھا۔ دو چار گھونسوں کے بعد وہ گتھم گتھا ہو گئے۔ چاروں طرف خاموشی تھی، صرف ان کے سانس کی آواز تھی جو اب ٹھہر ٹھہر کر دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

ایک بار میں ہی وہ دونوں لڑکھڑائے اور فرش پر گر گئے۔ پہلے وہ اوپر تھا، پھر لڑکا اوپر آیا۔ اب بھی دو دو ہاتھ کی لڑائی کے اصول نہیں چھوڑے گئے تھے۔ سوائے گھونسوں کے اور کسی بھی وار سے کام نہیں لیا جا رہا تھا۔ لوٹتے پوٹتے وہ دیوار سے بلیک بورڈ تک اور پھر دروازے تک آ گئے۔

اُسے اپنے مُنہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ لڑکے کا مکّہ بلا کا سخت تھا۔ اُسے لگا جیسے اس کی طاقت جواب دے رہی ہو۔ لڑکا اس کے اوپر تھا اور اندھا دھند مکّوں کی بارش کر رہا تھا۔ اندھوں کی طرح اس نے ایک ہاتھ چلایا۔ لڑکے کے کان پر پڑا۔ اس کا گھونسا ایک لمحے کے لیے اُسے بے ہوش

کر گیا۔ اس کے ہاتھ آگے بڑھے اور اب اس کا مکّہ لڑکے کی گردن پر پڑا۔

لڑائی ایک نئے دَور میں داخل ہو گئی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے لڑکے کے چہرے پر دَباؤ ڈالا۔ تکلیف برداشت نہ کرتے ہوئے لڑکا ایک طرف کو لڑھک گیا۔ اب وہ اس کے اُوپر تھا۔

دروازہ اسی طرح بند تھا۔ ایک گھونسا، دوسرا، تیسرا — ہر بار لڑکا تکلیف سے چیخ اُٹھتا۔ اُس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ تب اُسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ خود بھی بے ہوش ہوتا جا رہا ہو۔

اُس نے بے ہوش لڑکے کو چھوڑ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے ناک سے خون بہے جا رہا تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا، لیکن اُس کی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔" اب اور کوئی ہے ؟" بیٹھی ہوئی آواز میں اس نے چیلنج کیا۔

بھی خاموش تھے۔ شرف الدّین نے بھی مسکرانا بند کر دیا تھا۔ ایک سنّاٹا سا چھایا ہوا تھا۔ بالکل، مکمل خاموشی۔ لڑکوں نے دَم سادھ رکھے تھے.... بم پھٹ چکا تھا۔!

وہ زور سے کھلکھلا کر ہنسا۔

لڑکا آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہا تھا۔ پہلے وہ ذرا سا ہلا، پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر مسکرانے لگا۔ اُس کے منہ اور ناک سے اب بھی خون بہہ رہا تھا، لیکن وہ مسکرا رہا تھا۔

ایک لڑکا اُٹھا "میں پانی لاتا ہوں سر!"

جب وہ جگ بھر کر پانی لے آیا تو شرف الدّین نے دروازہ پھر بند کر دیا۔ شرف الدّین نے پہلے اُسے منہ دُھلایا۔ ایک لڑکے نے اُس کے کپڑے جھاڑے۔ اس دوران میں لڑکوں نے ڈیسک پھر جوڑ کر رکھ دیے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔ زخمی لڑکا آہستہ آہستہ مسکراتا رہا۔ جب شرف الدّین اس کا منہ بھی دُھلا چکا تو اس نے اُٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑے اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

شرف الدّین اُس کی طرف مُڑا۔ پہلے کی طرح ہی اُن کی نظریں ملیں۔ پھر شرف الدّین نے کہا — "تم ہیڈ ماسٹر سے رپورٹ کرے گا؟" اس کا لہجہ اب بھی ناخواندہ پٹھانوں جیسا تھا اور آنکھوں میں بے اعتباری اور نفرت کی جھلک تھی۔

"نہیں!" اُس نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔ "یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔"

"یس سر!" یکدم شرف الدین کا لہجہ بدل گیا اور وہ ناخواندہ پٹھان سے ایک سُلجھا ہُوا انگریزی جاننے والا نوجوان بن گیا۔ "یس سر، یو ٹیچ سر، اینڈ اِف اینی وَن آف دِیز راسکلز میکس اے مس چیف، آئی وِل ڈیل وِد دیم!" (آپ پڑھائیے سر، اور ان شیطانوں میں سے اگر کسی نے بھی شرارت کی تو میں اُسے مزہ چکھا دوں گا!)

اس نے چاک اُٹھانے سے پیشتر کلاس کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ لڑکے اپنی اپنی کاپیاں، پنسلیں سنبھال رہے تھے۔ اُن کی نظروں میں بے اعتباری نہ تھی۔ اعتماد تھا۔ اُس کے لیے عزت تھی، اور قدر و منزلت تھی۔

اُن کے درمیان کی خلیج اب بھر چکی تھی۔

○○

ایک اکیلا میک سوڈان رال

کنکر لڑھکیاں کھاتا ہوا نالی سے ٹکرایا اور وہیں کنارے پر رُک گیا۔

وہ اپنے خیالات میں مگن نالی پھلانگ کر لگ بھگ پندرہ قدموں تک اسی رفتار سے چلتا گیا۔ پھر اُس کی رفتار کم پڑ گئی۔ پھر وہ بالکل ہی رُک گیا اور دائیں بائیں اس طرح سے دیکھنے لگا جیسے اپنی کوئی بیش قیمت چیز کہیں بھول آیا ہو۔ کچھ لمحوں کے اس لاشعوری اور ناکام عمل کے بعد اُس نے ایک قدم آگے بڑھایا، پھر رُک گیا جیسے کوئی کتا اپنی ہڈی کہیں دفن کر کے جگہ بھول جائے۔ وہ گھوما۔ دو قدم پیچھے مڑا۔ پھر فیصلہ کُن انداز سے چل کر نالی کے کنارے تک گیا۔ کنکر پر نظر پڑتے ہی اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ جیسے اپنی بیش قیمت چیز پھر مل گئی ہو۔ اس نے دُزدیدہ نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کنکر اٹھا لیا۔ شرم کے مارے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ پیشانی پر عرقِ انفعال کے قطرے جھلملا اُٹھے۔

چند قدم آگے چل کر اُس نے مٹھی کھول دی۔ کنکر پھر سڑک پر گر پڑا۔ اُس نے دائیں پاؤں سے ایک ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ کنکر اُچھل کر کچھ گز اور آگے چلا گیا۔ اُس کی آنکھیں پھر چمک اُٹھیں۔ وہ کنکر کو ٹھوکریں مارتا آگے بڑھتا گیا۔ اب وہ راہ چلتے لوگوں کی پروا کیے بغیر چلتا جا رہا تھا۔

چوک پر پہنچ کر اُس نے ایک آخری ٹھوکر سے کنکر کو سامنے سے آتی ہوئی بس کے نیچے پھینک

دیا۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ جیسے مدّتوں کی نیند سے جاگ رہا ہو۔ جلدی جلدی پلکیں جھپکتے ہوئے اُس نے ایک بار اپنی پیشانی کو ہاتھوں سے دبایا، اُسے کچھ آرام ملا۔

چوک کو پار کر چکنے کے بعد وہ جس سڑک پر مڑا اُس پر ٹریفک کا شور کچھ کم تھا۔ اُس کی رفتار کچھ دھیمی ہو گئی۔ اُس کی نظر دائیں طرف کی دکانوں کے سائن بورڈوں پر پھسلتی ہوئی اُس کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ پہلی دکان کا بورڈ تھا "شام برادرز" اُس نے ہونٹوں میں ہی بڑبڑاتے ہوئے اسے اُلٹا کر کے پڑھا۔ "ماشس برادرز"۔ دوسری پر تھا "شُکل اینڈ کو" اُس نے پھر درستی کی "لکش اینڈ کو" اور وہ بڑھتا گیا۔ یہ اس کا مرغوب مشغلہ تھا۔

نئے چوک سے مڑ کر وہ آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ سامنے سے ربڑ کے غباروں والا ایک لڑکا گذرا۔ لال اور چتکبرے غبارے دیکھتے ہی اس کا دل مچل اُٹھا۔ اس نے آواز دے کر لڑکے کو ٹھہرایا۔ لڑکے نے اُس کے صاف اور قیمتی کپڑے دیکھ کر اُسے پچاس پیسے والا بڑا غبارہ دینا چاہا۔ سر کو انکار میں ہلاتے ہوئے اُس نے بیس بیس پیسوں والے دو چھوٹے غبارے اُس کی چھڑی سے توڑ لیے اور پھر اُسے پچاس پیسے کا سکّہ دے کر دس پیسے واپس لیے بغیر وہ آگے بڑھ گیا۔ غباروں والا لڑکا پیچھے سے اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

دونوں غباروں کو تاگے سے ایک ہاتھ میں پکڑے وہ لوکل بس میں داخل ہوا۔ دروازے کے ساتھ والے برتھ پر باپ کی گود میں بیٹھے ایک بچّے کی آنکھیں غباروں کو دیکھ کر چمک اُٹھیں اور اُس نے معصومیت میں اُنھیں لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اُس کی نظریں بچّے کی نظر سے ملیں۔ بچّے کی آنکھوں میں التجا تھی۔ وہ ٹھٹھکا، لیکن پھر اُس نے زبان نکال کر اُس کا منہ چڑا دیا۔ کسی نے بھی اُسے نہیں دیکھا۔ لیکن کنڈکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل اُٹھی۔ شاید اُس نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ وہ دائیں بائیں دیکھتا ہوا ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی اُس کے پیچھے بس پر چڑھنے والی ایک ادھیڑ عمر موٹی عورت اُس کے ساتھ سٹ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے دونوں غبارے اپنی گود میں رکھ کر ہاتھوں سے انھیں دبا لیا اور پھر اپنے ساتھ بیٹھی عورت کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ ادھیڑ عورت ساری پہنے تھی اور اپنے موٹاپے کی وجہ سے سیٹ کا آدھے سے زیادہ حصّہ قابو کیے ہوئے تھی۔ اس لیے وہ اُس کے اور کھڑکی کے بیچ پِسا جا رہا تھا۔ وہ اُس کے کولھوں کی طرف دیکھتا رہا اور دونوں ہاتھوں سے

اپنی آغوش میں رکھے ہوئے غباروں کو سہلاتا رہا۔

اگلے بس سٹاپ پر وہ عورت وہاں سے اُٹھ کر خالی لیڈیز سیٹ پر بیٹھ گئی اور وہ پھر اکیلا رہ گیا۔ اس نے غبارے گود سے اُٹھا کر سینے سے بھینچ لیے۔ آہستہ سے اس نے کہا "گرین روڈ" اور پیسے دے کر ٹکٹ لیتے ہوئے اس نے کنڈکٹر کی طرف دیکھا جو اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اُس نے بھینچے ہوئے ہونٹوں میں اُسے گالی دی۔ "باسٹرڈ!" اور غبارے پھر گود میں رکھ لیے۔

اپنے سٹاپ پر اُتر کر وہ سیدھا پان والے کی دُکان تک گیا۔ غباروں کے تاگے اب بھی اُس کے بائیں ہاتھ کی چھنگلی سے لپٹے ہوئے تھے۔ اس نے دُکان کے آدم قد آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ پتلون کی کریز سنواری۔ کوٹ کی شکنوں کو دور کیا۔ پان چباتے ہوئے وہ گلی میں مُڑا۔

سامنے وہی صبح والی لڑکی کھڑی تھی۔

لڑکی بے حد موٹی اور کالی تھی۔ اس کی عمر اٹھارہ برس کے لگ بھگ تھی لیکن دیکھنے میں تیس سے کم کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ابھی گذشتہ ماہ ہی اُس کے خاوند نے مار پیٹ کر اُسے گھر سے نکال دیا تھا اور اب وہ اسی گلی کے نکڑ والے مکان میں اپنے بھائی پیٹر کے ساتھ رہ رہی تھی۔ پیٹر جو اُس کا دوست نہیں تھا۔

یہ لڑکی اکثر اُسے اشارے کیا کرتی تھی۔

وہ جھنجھلا گیا۔ پاس سے گذرتے ہوئے اُسے موٹی لڑکی کے پسینے کی بدبو آئی۔ یہ بدبو اُسے اکثر خود سے بھی آتی تھی۔ وہ اس بدبو سے نفرت کرتا تھا۔ گلی سے گذرتے ہوئے اُس کے ذہن میں وہی دو جملے آئے، جو اس لڑکی کو دیکھتے ہی بار بار اُس کے شعور کا طواف کرنے لگتے تھے۔

"یہ پیٹر کی بہن ہے!"

"پیٹر میرا دوست نہیں ہے۔"

"یہ پیٹر کی بہن ہے!"

"پیٹر میرا دوست نہیں ہے!"

وہ اُس کے پاس سے گذرتے ہوئے ذرا سا لڑکھڑایا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے غبارے اپنے سینے سے لگا لیے اور پھر چپ چاپ گذر گیا۔ ...... کاش یہ لڑکی ذرا پتلی ہوتی۔ اس نے

لاشعوری طور پر سوچا۔

اس کے کمرے کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے مڑ کر اپنے نام کی تختی کی طرف دیکھا، جو لکڑی پر پینٹ کے الفاظ تراش کر اور چپکا کر بنوائی گئی تھی اور جس پر اس کے تیس روپے خرچ ہوئے تھے۔

"میک سوڈان لال۔"

اُس نے دَبے لفظوں میں اپنا نام پڑھا، مسکرایا۔ پان کی پیک گلی میں تھوک کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ اس نے بند کر دیا۔ غبارے چارپائی پر رکھ کر اس نے کوٹ اُتار دیا، پھر قمیض اُتار دی اور پھر پتلون بھی اُتار دی۔ اب اس کے جسم پر صرف انڈرویر تھا۔ وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ اُس نے غبارے اپنے رُخساروں کے دائیں بائیں رکھ لیے اور ہاتھوں سے انھیں مسلنے لگا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر لٹکی اپنی مرحوم ماں کی ایک بڑی سی تصویر پر مرکوز تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ زار زار رو رہا تھا۔

ایک اکیلا، تنِ تنہا، میک سوڈان لال — نہ ماں، نہ باپ، نہ بہن، نہ بھائی —!

ایک اکیلا مقصودن لال۔ جو ریلوے کے خلاصی برکت لال کا بیٹا تھا۔ برکت مسیح — جو اپنے نام کو بارکٹ میسی لکھا کرتا تھا اور جس نے اپنے خون میں چوتھی پُشت سے کسی انگریز ٹامی کے خون کی آمیزش کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے بیٹے مقصودن لال کو میک سوڈان لال بنا دیا تھا۔ کرسچین کالونی کے اپنے آبائی مکان میں تیس برس کی عمر کا مقصودن لال الگ تھلگ باہر سے کھلنے والے ایک بیٹھک نما کمرے میں اکیلا رہتا تھا۔ مکان کا باقی حصّہ کرائے پر اُٹھایا ہوا تھا۔ سات سو روپے ماہانہ کرایا ہی اس کے گزارے کی سبیل تھی۔

مقصودن لال!

میک سوڈان لال!

بارہا اس کا دل چاہتا کہ اُسے کوئی میک کہہ کر بلائے۔ کوئی اس سے بات کرے یا اُسے اپنے گھر کھانے کی دعوت پر ہی بلائے، لیکن اُس کی ماں مر چکی تھی۔ اُسے فوت ہوئے اب تو ایک

برس سے بھی زیادہ ہوگیا تھا۔ اور اس ایک برس میں ایک دن کے لیے بھی ماں کی یاد نے اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہ اُسے بھولا نہیں تھا۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ماں کا مہربان چہرہ، اور اُس کا پتلا، کمزور لیکن خوب صورت جسم اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا۔ وہ خواب میں "ماما، ماما" پکار کر ہڑبڑاتے ہوئے اُٹھ بیٹھتا۔ ماں، صرف ماں...... اس کی زندگی کے خلا میں ماں کا وجود ہی ایک ٹھوس مادّے کی طرح جما ہوا تھا۔ اور اب تو یہ مادّہ بھی تحلیل ہو کر نہ جانے کہاں گُم ہو گیا تھا۔ اب یہ خلا اور بھی گہرا، وسیع اور بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا، بالکل اکیلا، اور اس اکیلے پن کے احساس نے آہستہ آہستہ اسے دنیا سے نفرت کرنا سکھا دیا تھا۔

وہ تین سال کا تھا، جب اس کا باپ گرجے کی آگ میں جھلس کر مر گیا تھا۔ اُس دن سے ہی اس کی ماں گھر میں یوں گوشہ نشین ہو گئی تھی کہ آٹھ برس کی عمر تک وہ خود کو اور اپنی ماں کو ہی دنیا کے دو واحد فرد سمجھتا رہا تھا۔ یہ درست تھا کہ اس کی ماں ہفتہ میں ایک بار بازار بھی جاتی تھی۔ اُن کے گھر میں دودھ والا، سبزی اور پھل والا، دھوبی اور کئی دوسرے لوگ بھی آتے تھے، لیکن اُسے ہمیشہ لوگوں سے دُور رکھا گیا تھا۔ اپنے خاوند کی موت کے بعد اس کی ماں اُسے دنیا کے کسی اور بھی جاندار کے سامنے لے جاتے سے ڈرتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ کال بیل بجتے ہی اُسے اندر کے کمرے میں بند ہو جانا پڑتا اور اس وقت تک وہیں رہنا پڑتا جب تک آنے والا اپنا کام پورا کر کے واپس نہ چلا جائے۔

اس کی ماں بہت نفیس ماں تھی۔ پیار سے بھری ہوئی۔ صاف صاف، نرم نرم، دُبلی پتلی سی۔ اُسے اس کی گود میں بیٹھنے سے ایک خاص قسم کے آرام کا احساس ہوتا۔ دس برس کی عمر تک وہ اکیلا کبھی نہیں سویا تھا اور اُس کے بعد بھی جب کبھی اس کی ماں اُسے اکیلا سُلا دیتی تو وہ دیر رات گئے نیند نہ آنے کی وجہ سے اُٹھ کر اُس کے بستر میں گھس جاتا۔ ماں اُس کی زندگی کا اہم ترین جزو تھی،

دس برس کی عمر میں اس نے پہلی بار اپنی ماں کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی صورت دیکھی تھی اور اُس کے ننھے سے دماغ میں پہلی بار یہ خیال آیا تھا کہ دنیا میں اُس کی ماں اور خود اُس کے علاوہ اور لوگ بھی بستے ہیں۔ یہ شخص ایک پادری تھا جو کچھ دنوں سے ان کے گھر آنے جانے لگا تھا۔ پادری اُس کے ساتھ بہت نیکی اور محبت سے پیش آتا، اس لیے وہ جلد ہی اُس سے گھُل مل گیا تھا۔ ایک بار وہ اس کی ماں کی اجازت سے اُسے بازار بھی لے گیا۔ بازار میں لوگوں کے ہجوم اور دُکانوں میں

چہل پہل سے وہ ڈر گیا اور رونے لگا۔ تب پادری اُسے ایک پارک میں لے گیا اور وہاں اپنے ہم عمر بچوں کو کھیلتے دیکھ کر اُس کی آنکھیں حیرت سے چوڑی ہو گئی تھیں۔

اس کی زندگی میں انقلاب گیارہ برس کی عمر میں آیا، جب اس پادری نے اس کی ماں سے شادی کرلی۔ اُسے وہ دن اب بھی اچھی طرح سے یاد تھا۔ وہ سب چرچ گئے تھے۔ شمعیں جلائی گئی تھیں۔ کیک کاٹا گیا تھا۔ اس کے بعد اُن کے مکان کی بوجھل فضا میں مبارک گیتوں اور آیتوں کی گونج سُنائی دی تھی۔ اس کی ماں نے بہت نفیس ریشمی ملبوس زیب تن کیا تھا۔ اس دن اس نے بھی پہلی بار سوٹ پہن کر گلے میں بو اور ٹائی لگائی تھی۔ اُس کی ماں نے اُسے بتایا تھا کہ بو اور ٹائی دونوں مل کر اس کی علامت بن جاتے ہیں، لیکن آج کل لوگ صرف بو یا ٹائی ہی استعمال کرتے ہیں۔ وہ بہت رات تک خوش خوش گھومتا پھرتا رہا تھا — پادری باپ کے اُن کے گھر میں سکونت پذیر ہونے کے بعد جو ایک برس گذرا وہ اُس کی زندگی کا بہت آرام دہ اور تسکین سے بھرپور برس تھا۔ پادری باپ اس سے بہت پیار کرتا تھا اور اُس کی ماں نے اُسے کہا تھا کہ وہ پادری باپ کو "فادر" نہ کہہ کر "پاپا" کہے، کیوں کہ 'فادر' تو سب ہی لوگ کہہ کر بُلاتے ہیں۔ لیکن نہ معلوم کیوں اس کا دل پادری باپ کو "پاپا" کہنے کو نہ مانتا تھا۔ اس کے دل کے کسی اندھیرے کونے سے اپنے نئے پاپا کے تئیں نفرت اُبل اُبل پڑتی۔ ایک بار اس نے لاشعوری طور پر ہی اپنے نئے پاپا کے سوٹ کو قینچی سے کاٹ دیا۔ بعد میں اُسے اپنی کرتوت پر بہت ندامت ہوئی، لیکن پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی کہ کبھی کبھی وہ اس کے پاس بیٹھتے ہی رو پڑتا۔ پادری پاپا اس کے لیے نئے نئے کپڑے اور پھل و مٹھائیاں وغیرہ لاتے۔ وہ خوش بھی ہوتا، اس کا دل نئے پاپا کو پیار کرنے کو نہیں چاہتا.... لیکن ..... اور ایک بار اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ دھکا دے کر اپنے مکان کی دوسری منزل سے پادری پاپا کو نیچے گرا رہا ہے، تو وہ گناہ کے احساس سے کانپ اُٹھا اور کئی دنوں تک خود کو لعن طعن کرتا رہا۔

وہ اب اسکول بھی جانے لگا تھا۔ طبیعت سے وہ چُپ چاپ سا، گوشۂ تنہائی پسند کرنے والا لڑکا تھا، اس لیے کھیلوں میں بالکل حصّہ نہ لیتا۔ اس کے پاس اتنی فالتو طاقت بھی نہیں تھی جو وہ کھیلوں میں ضائع کرتا۔ وہ لڑکوں میں ہر دل عزیز نہ بن سکا۔ پھر جب اُس کے نئے پاپا بھی ہیضے کا شکار ہو کر

مر گئے اور اُس کی ماں دوبارہ بیوہ ہوگئی تو اُسے بھی اسکول سے اُٹھا لیا گیا۔ اس دن سے لے کر ماں کی موت تک وہ اُس کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ ایک دن کے لیے بھی اس سے الگ نہیں ہوا تھا۔

اور اب تنہائی اس کی زندگی کا اہم ترین جزو بن کر رہ گئی۔ اس کے ذہن میں ہزاروں تانتو لاشعوری طور پر ہی ٹپک ٹپک کر اپنی جڑیں گہری کرتے گئے تھے اور وہ انھیں اپنی زندگی کے تمام تر خون سے پال رہا تھا اور زیادہ گہرا کرتا آ رہا تھا۔

ماں کی موت کے بعد ہی وہ گھر کے ایک الگ کمرے میں اُٹھ آیا تھا اور باقی کا حصّہ کرائے پر دے دیا تھا۔ وہ صبح سے لے کر شام تک اپنے کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ شام کے وقت ذرا باہر نکلتا جاتے جاتے ایک چکّر چکلے کا کاٹتا اور بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ کیے، ہوٹل سے کھانا کھا کر، صبح کے لیے ڈبل روٹی اور دودھ لیتے ہوئے گھر واپس آجاتا اور سو جاتا۔۔۔۔۔ سوتے ہوئے اُسے عجیب بے ہنگم سے خواب دکھائی دیتے۔ ان کا مرکزی نقطہ اس کی ماں کا چہرہ ہوتا۔ مہربان، پتلا سا، گورا سا، نرم نرم۔۔۔۔۔۔ اور جب ایسے خوابوں سے ہڑبڑا کر وہ اُٹھ بیٹھتا تو ساری ساری رات بیٹھ کر خدا سے اور یسوع مسیح سے دعائیں مانگتا رہتا۔ اپنے ناکردہ گناہوں پر پشیمان ہوتا، روتا اور پھر تھک کر سو جاتا۔

ایک اکیلا۔ تنِ تنہا، سیک سوڑان لال۔!

لیکن تنہائی اب بہت بوجھل محسوس ہونے لگی تھی۔ جب سے کوتے کے مکان میں پیٹر کی بہن سسرال سے ٹھکرائی ہوئی واپس آئی تھی (پیٹر جو اس کا دوست نہیں تھا!) وہ اس کے بارے میں بھی سوچتا۔ کاش پیٹر کی بہن اس کی ماں جیسی ہوتی۔ پتلی سی، کچھ گوری سی، کچھ مہربان سی اور وہ اُسے اپنے پاس بُلا کر اُس کی گود میں سر رکھ دیتا۔ لیکن پیٹر کی بہن قطعاً اُس کی ماں جیسی نہیں تھی۔

تنہائی کے اس بوجھل کمبل کو وہ اُتار کر پھینکنا چاہتا تھا۔ ایک پل کے لیے، ایک لمحے کے لیے — صرف ایک لمحے کے لاکھویں حصّے کے لیے۔

اُسے ایک ساتھی کی اشد ضرورت تھی۔ ایک ماں کی! ایک بیوی کی — یا پھر دونوں کی —

اور پھر ایک شام، نہ معلوم کون سے جذبے کے زیرِ اثر وہ سیڑھیاں چڑھ ہی گیا۔

پہلی منزل پر دائیں بائیں دو دروازے تھے۔ لوگ دروازوں کے بیچوں بیچ بھی کھڑے تھے اور آجا بھی رہے تھے۔ وہ داہنی طرف کے دروازے سے داخل ہوا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں جھلملا رہی تھیں لیکن وہ اندر داخل ہو ہی گیا۔ اس کی آنکھیں روشنی سے چندھیا گئیں۔ ایک بڑا سا گول کمرہ تھا۔ سامنے صوفوں پر گوشت پوست کی سجی سجائی دکانیں لگی تھیں۔ دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے کیبن تھے۔ گراموفون پر کوئی عشقیہ غزل بج رہی تھی۔

وہ ٹھٹھک گیا۔

اس نے صوفوں پر نظر دوڑائی۔ سبز ساڑی، گہری لال، لیکن ذرا موٹی ـــــ کاش یہ ذرا پتلی ہوتی۔ اس نے لاشعوری طور پر سوچا۔ نیلی قمیص اور ہلکی نیلی پائنچوں پر کشیدہ کاری کے کام والی شلوار پہنے عورت ـــ موٹی اور بھدی (یہ پیٹر کی بہن ہے۔ پیٹر میرا دوست نہیں ہے) گلابی سکرٹ، ہلکی گوری ٹانگوں پر نرم نرم سنہرے روئیں ـــ اچھی، بہت اچھی، لیکن اس کے ہونٹ ذرا موٹے ہیں..... اُس کی ماما کے ہونٹ تو پتلے ہیں..... چھی! کیا رُدّی بات سوچی ہے اُس نے! آج رات اکیلے میں سونے سے پہلے پچاس بار "ہیل میری" گا کر سونا چاہیے۔ اس کے ذہن میں گونجا۔

"آیئے صاحب!"

اس نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔ ایک معمر عورت اُسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "جی، جی....." اور اُسے اندر کی طرف مُڑتے دیکھ کر پیچھے بڑھ گیا۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی صوفے بچھے ہوئے تھے لیکن اور کوئی نہیں تھا۔ اُس کے اشارے پر وہ چابی لگے ہوئے کھلونے کی طرح ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے رومال سے پسینہ پوچھا۔ معمر عورت چلی گئی۔

ایک لڑکی آئی۔ وہ اُس کے سامنے پہنچی۔ پتلی۔ بالکل پتلی، گڑیا سی ـــ ہلکا پاؤڈر جس سے اُس کا گندمی رنگ چھُپ نہیں رہا تھا۔ ہونٹ بھی پتلے تھے۔ ہلکے پیازی رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔

ایک لمحے کے لیے وہ اُس کے سامنے ٹھہری، پاؤں پر گھومی، جیسے اپنا جسم اُسے دکھا رہی ہو، پھر اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل اور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے۔ لڑکی نے پچاس پچاس کے دو نوٹ اور بیس روپے کا ایک نوٹ لے

لیے۔ ہونٹوں میں ہی بڑبڑائی۔ "یہ کمرے کا" اور پھر اسی پھرتی سے چلی گئی۔
اُس کے ذہن میں بگولے رقص کر رہے تھے۔
اُسے معلوم نہیں کب وہ واپس آئی۔ کب وہ اُسے ہاتھ سے پکڑ کر ایک کیبن میں لے گئی۔ وہ
دہ کتنی دیر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں رہا، لیکن جب اُسے کچھ ہوش آیا تو وہ "ماما، ماما"..... پکار پکار
کر رو رہا تھا، اور وہ اُسے تھپکیاں دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"کچھ نہیں ہوگا..... گھبراؤ نہیں..... تم آؤ تو...... اوہ میرے خدا، کیسے بچے سے
پالا پڑا ہے!"

OO

من بہادر

من بہادر کی ساری رُوح جیسے سمٹ کر اُس کی آنکھوں میں آگئی۔ اُس کی نظروں نے اوپر نیلے آسمان کا طواف کیا۔ جیسے کچھ غیر مرئی سی چیز کی تلاش کر رہی ہوں۔ دُور اُوپر دو مُرغابیاں دریا کی طرف اُڑی جا رہی تھیں۔ تبھی مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے من بہادر کی رُوح ایک صاف، سفید، تہہ شدہ رومال کی طرح اُس کی آنکھوں سے نکلی۔ ایک لمحے کے لیے ہوا میں معلق رہی اور پھر..... پھر مُرغابیوں کے پیچھے اُڑ گئی۔ جب اُس نے میری طرف نظریں گھمائیں تو وہ بے جان تھیں۔

" افسوس ہے....." اُس نے کہا۔" اپنا سکاٹ باندوق اپنے پاس نئیں تھیں۔ !"

شہر کے باہر بہتے ہوئے نالے کے کنارے چھوٹے سے قلعے میں آہستہ آہستہ زندگی جاگ رہی تھی۔ لودھیوں کے زمانے کے بنے ہوئے اس پُرانے قلعے میں اب کئی سرکاری دفاتر تھے۔ ایک ہوزری سکھانے کا سینٹر بھی تھا۔ سینٹر میں ٹریننگ لینے والے لڑکے آنے شروع ہو گئے تھے۔ جب پرنسپل مسٹر باسُو دُور سے آتے دکھائی دیے تو من بہادر نے میری کرسی اُٹھا کر برآمدے میں رکھ دی اور دہکتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی باسُو صاحب کی میز کے پاس لگا دی۔ مسٹر باسُو نے دفتر میں آتے ہی اپنی بھاری بھرکم آواز میں پوچھا۔

" آل ویل، کلرک ؟

"یس سر!" اس نے ایک مشین کی طرح پھرتی سے جواب دیا۔

اندر سنگھ نے روزانہ کی طرح ہی کہا۔ "ست سری اکال جی۔!"

من بہادر بولا۔ "بندگی۔"

گور بخش سنگھ نے چق اُٹھا کر دُور سے ہی کہا۔ "گڈ مارننگ سر!"

مسٹر باسو ڈاک دیکھنے لگے تو اندر سنگھ اور گور بخش سنگھ اپنی اپنی لاٹھیاں اُٹھا کر ہوزری ٹریننگ سینٹر کے سب کمروں کی صفائی دیکھنے چلے گئے۔ من بہادر میرے پاس کھڑا رہا۔

"نئیں آیا، بابو جی، ڈاک دیکھا؟"

میں اس کے بہتے ہوئے خیالات کی لہروں کو ایسے ہی پکڑ لیا کرتا تھا۔

یہ شاید اس لیے ممکن تھا کہ اپنے تین برسوں کے قیام کے دَوران وہ لگ بھگ آٹھ گھنٹے روز میرے ساتھ گذارتا تھا۔ میں ٹائپ کرتا یا کیش بک لکھتا۔ وہ میری میز کے پاس اسٹول پر مستعدی سے بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھار ایک آدھ بات کر لیتا۔ فطرتاً کم گو تھا۔ گورکھالی تو فر فر بولتا تھا، لیکن ہندوستانی مشکل سے اس کی زبان پر چڑھتی تھی۔

مجھے علم تھا کہ وہ اپنی پنشن کے کاغذات کے بارے میں پوچھ رہا ہے جو ہیڈ ٹریژری آفس مانڈلے برما سے آنے والے تھے اور جن کا انتظار وہ کئی برسوں سے کر رہا تھا۔ اُس نے بیس برسوں تک آرمڈ پولیس برما کی نوکری کی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں وہ نیپال واپس جانے کے ارادے سے کلکتہ آ گیا۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں اپنا ارادہ بدل کر ہندوستان میں ہی رہ گیا اور گذشتہ تین برسوں سے سرکار کے اس ٹریننگ سینٹر میں چوکیدار کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس سارے وقفے کے دَوران میں اُس کی طرف سے درجنوں عرضیاں ٹائپ کر کے مانڈلے بھیج چکا تھا۔ ایک دو چٹھیوں کا جواب بھی آیا تھا۔ لیکن اُس کی پنشن کے کاغذات ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ اُس کی پنشن کا روپیہ اب بڑھ کر کئی ہزار تک جا پہنچا تھا۔ میں نے سر ہلا کر کہا۔ "ابھی میں نے ڈاک نہیں دیکھی، من بہادر!"

وہ چق اُٹھا کر سیدھا اندر چلا گیا۔ "ساب! ڈاک میں امرا کاگت نئیں ہوتا؟"

مجھے سُنائی دیا۔ صاحب نے کہا "من بہادر، ساری، نہیں ہوتا۔"

جب وہ باہر نکلا تو اس کے چہرے پر جھریاں کچھ اور گہری ہو گئی تھیں۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ میں نے پوچھا "من بہادر۔ اگر روپے پیسے کی ضرورت ہو تو مجھ سے قرض لے لو۔"

اُس نے پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ جدھر مرغابیاں اُڑ کر گئی تھیں، آہستہ سے بولا "دو چار روپے اُدھار..... کیا ہوتا بابوجی اس سے؟ اپنا سکاٹ بانڈوق ہوتا تو سالا مانڈلے والا کلرک کو گولی مار دیتا!"

میں نے پھر کہا "آجائیں گے کاغذ! سرکار کا روپیہ کبھی نہیں ڈوبتا۔ جب کاغذ آجائیں گے تو اکٹھا مل جائے گا۔!"

وہ شک و شبہ میں مبتلا، تھوڑی دیر کے لیے میرے لفظوں سے ہمت کا خراج لینے کے لیے رک گیا۔ پھر بولا "سو تو ہے بابوجی! پر تین سال ہوئی گا۔!"

میں نے کہا "ڈیڑھ سو روپے فی ماہ۔ تین برس کا پانچ ہزار چار سو بنتا ہے...... اور تمہارا گزارہ تو ہو ہی رہا ہے۔ فکر کس بات کی ہے؟"

ٹریننگ سینٹر کی گھنٹی ٹن ٹن بج اٹھی۔ اندر سنگھ چوکیدار گھنٹی بجانے میں مصروف تھا اور گوربخش سنگھ چپڑاسی سٹور سے چاک نکال نکال کر لڑکوں کو دے رہا تھا۔ من بہادر نے پھر کہا "آج مانڈلے والا کو بہن چھٹی لکھے گا۔ بابوجی — ہاں اور کہے گا کہ اگر امرا کاگت نئیں بھیجا تو سالا سکاٹ بانڈوق......"

میں نے اپنا سر ہلا دیا۔ مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ من بہادر کی تیکھی، بغیر پلکوں کی جھریوں کے تانے بانے کے بیچ میں گندے جوہڑوں کی طرح دو آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو تیر رہے تھے۔

آدھی چھٹی کے وقت گوربخش سنگھ نے مجھے بتایا کہ اپنے کوارٹر میں بیٹھا من بہادر گھر کا سارا سامان اکٹھا کر رہا ہے اور یہ کہ اس نے اپنی ساری چھوٹی موٹی چیزیں سرداری لال کلینر کے ہاتھ ڈھائی سو روپے میں بیچ ڈالی ہیں۔ اب اُس کے پاس صرف تن کے کپڑے، سکاٹ بندوق، کھکری جسے وہ ککھری کہتا تھا۔ اور دو چار اور ایسی ہی چیزیں باقی رہ گئی ہیں۔ میں نے اُسے بلا بھیجا۔ جیب سے ایک سو روپے نکال کر اُسے دیے اور کہا "سامان مت بیچو۔ جب ضرورت ہو مجھ سے مانگ لینا۔

تمہاری پنشن کے کاغذات کے لیے آفیشل لیٹر لکھ دیا ہے..... اور ہاں، یہ تو بتاؤ کہ روپے کی اتنی اشد ضرورت کیا پڑ گئی؟"

"نئیں بتائے گا، بابوجی!" اُس نے صاف صاف کہہ دیا۔

میں نے کہا۔ "اچھا نہ بتاؤ، لیکن دیکھو فضول میں روپے خرچ نہ کر دینا۔ تمہاری ایک اکیلی جان ہے۔ ڈیڑھ سو ہر ماہ تنخواہ مل جاتی ہے۔ صاحب کے گھر سے بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ کبھی بیماری وغیرہ آ جائے تو..... اب تم جانو اور تمہارا کام۔"

اُس کے چہرے پر تاسف کے جذبات اُبھرے۔ اُس نے کہا۔ "بابوجی۔ آپ صاب سے بولے گا تو ام چھٹی لے لے گا۔ دو۔ دن..... انبالہ جائے گا۔"

مجھے بہت حیرت ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ "انبالہ کیوں؟"

"نئیں بتائے گا۔" اُس نے پھر کہا۔

میں نے اُس کی چھٹی منظور کروا دی۔ جانے سے پہلے اُس نے مجھے شکر گزار نظروں سے دیکھا اور صرف اتنا ہی کہہ پایا۔ "کسی دن بتائے گا، بابوجی! یہ امارا جیون سالا کھوب ہے!" ایک دم اُس کے ہنستے چہرے پر سیاہی سی پت گئی اور وہ رونے لگا۔ "بابوجی! امارا لڑکی انبالہ میں بہت بیمار ہے۔ ایک دم ٹی بی ہو گیا ہے۔ جب امارے پاس سے بھاگا تھا تو ام بولا تھا، سالا تمہاری سکل نئیں دیکھے گا۔ گرُکھا کھون ہو گا تو نئیں دیکھے گا۔ ادھر سو بہادر سے بولا، تم من بہادر کی لڑکی بھگائے گا۔ من بہادر ایک دن تمارا کھون کرے گا! پر آج وہ بوہت بیمار ہے۔ امرا ٹیک بہادر کہتا ہے۔ انبالہ سے کھت آیا، اِتا اِتا کھون تھوکتا ہے ــــ اب میں جائے گا۔ اُسے دیکھے گا۔ اس کا علاج کرائے گا۔ آکھر تو لڑکی ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ سٹیشن جانے کے لیے تیار ہو کر آیا تو اس کے کندھے پر کپڑے کا ایک فوجی بیگ لٹک رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک پرانی شاٹ گن تھی جس کے دستے پر آدمی کی کھوپڑی کندہ تھی۔ اُس نے کہا۔ "امرا سکاٹ بانڈوق آپ رکھے گا، بابوجی! ام واپس آ کر لے لے گا۔ یہ ام کو جان ما پھک ہے!" میں نے بندوق لے لی۔ الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ باسو صاحب نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہہ دیا۔ من بہادر کی سنگل بیرل سکاٹ گن ہے۔

وہ مسکرا دیے

جب وہ تین دنوں کے بعد انبالہ سے لوٹا تو اُس کا چہرہ بے رونق تھا۔ آنکھیں اور سکڑ گئی تھیں اور چہرے کی جھرّیاں جیسے کسی نے ہتھوڑی اور چھینی سے کھود کھود کر اور زیادہ گہری کر دی تھیں۔ وہ بہت بوڑھا لگ رہا تھا۔ آتے ہی اس نے مجھ سے شاٹ گن مانگی۔ میں نے الماری سے نکال کر دے دی۔ اس نے آہستہ سے اعلان کیا۔ "ام شام کو کھیت جائے گا!"

شکار کا نام سنتے ہی اندر سنگھ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ جب بھی من بہادر شکار سے واپس آتا تو قلعے کے درجہ چہارم کے نوکروں کے کوارٹروں میں جیسے عید کا ماحول پیدا ہو جاتا۔ تیتر، مُرغابی اور دوسرے آبی پرندوں کا شکار ممنوع ہونے کے باوجود من بہادر کسی نہ کسی طرح چار پانچ تھیلے بھر ہی لاتا۔ ظالم کا نشانہ غضب کا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "تمھاری لڑکی کا کیا حال ہے؟"

"لڑکی مر گیا۔" اُس نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اسٹول پر بیٹھ گیا۔ شاٹ گن اس نے اپنے گھٹنوں پر جُھکا کر رکھ لی۔ زمین پر نظریں گاڑے ہوئے وہ بولا۔ "ایک کہانی سُنے گا، بابوجی؟"

تب ذرا سے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "کھاٹ منڈو کے پاس رانا گڈھ میں من بہادر کا باپ مرا۔ من بہادر کا عورت نو بچے پیدا کر کے مر گیا۔ تب من بہادر کھیتی کرتا..... کھیت جاتا۔ بھیڑیں پالتا، اون بیچتا۔ من بہادر نے پانچ لڑکی کا سادی کیا۔ دو لڑکی مر گیا۔ ایک لڑکی کو گورا اٹھا کر لے گیا۔ من بہادر دونوں کو مار دیا۔ تب من بہادر تیس اور چار سال کا تھا....." اُس نے اُنگلیوں پر گن کر مجھے سمجھایا۔

اُس نے گن ہاتھ میں اُٹھائی۔ "من بہادر کا چھوٹا لڑکی سو بہادر بھگا کر کھاٹ منڈو لے گیا۔ من بہادر ڈھونڈا، نئیں ملا۔ من بہادر نے گاؤں چھوڑ دیا۔ برما چلا گیا اور پُولس میں نوکر ہو گیا۔ بیس سال تک نوکری کیا۔ ایک برمن سے سادی کیا۔ وہ مر گیا۔ کوئی بچہ نئیں ہوا۔ پھر کلکتے واپس آیا۔ کلکتہ پتہ چلا سو بہادر دلّی ہے۔ دلّی پتہ چلا، انبالہ ہے۔ انبالہ گیا۔ گھر میں گھُس گیا۔ سو بہادر بنک میں چوکیدار تھا۔ وہ گھر نئیں تھا۔ لڑکی ام کو نئیں پہچانا۔ ام نے دیکھا وہ پریسن چت ہے، کھُس ہے۔

اُس کا ایک لڑکی بھی ہے۔ ۔ ام یہاں آ گیا۔ باسو ساب ام کو چوکیدار رکھ لیا۔ ٹھیک ؟"

میں نے سر ہلایا۔ وہ چپ ہو گیا۔ اِندر سنگھ چوکیدار میری کرسی کے پیچھے چپ چاپ کھڑا تھا۔ میں اُس کی کہانی خاموشی اور انہماک سے اُس کی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں سن رہا تھا۔ اُس نے پھر کہا "ٹیک بہادر ام کو بولا' سو بہادر بڑا حرامی ہے۔ امارا لڑکی کو دِلّی میں پہلے رنڈی بنایا۔ پیسہ کمایا۔ دو جگہ بیچا۔ پھر واپس بھگا لایا۔ جب وہ بیمار ہو گیا تو اِلاج نئیں کروایا۔ اسے مارا۔ کھوب مارا۔ ام سوچا' سو بہادر کو سکاٹ بانڈوق سے ملے گا۔ سالے کا کیمہ کیمہ کرے گا۔ پر امارا لڑکی بدھوا ہو جائے گا۔ تب سوچا' ابھی کچھ نئیں کرے گا۔"

"اب امارا لڑکی مر گیا ہے!" اُس نے میری طرف پُر معنی نگاہوں سے دیکھا۔

میں نے ایک لمبا سانس لیا۔ "تو'......؟"

اس نے شاٹ گن اُٹھائی۔ "سو بہادر کا کھون کرے گا۔ پھر کیمہ کیمہ کرے گا۔ اِندر سنگھ گورکش سنگھ کو کھلائے گا!"

اِندر سنگھ سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے کہا۔ "من بہادر، ہوش کی دوا کرو، تم سرکاری نوکر ہو۔ یہ برما یا نیپال نہیں ہے۔ ہندوستان ہے۔ یہاں خون کرنے والے کو پھانسی کی سزا بھی مل سکتی ہے۔"

وہ ہنس پڑا ۔۔ ایک کھوکھلی سی لیکن بہت بھیانک ہنسی ۔۔ پھر بولا ۔۔ "اِندر سنگھ کھیت چلے گا؟ مرگابی مارے گا تو، بابوجی کے گھر بھی بھیجے گا!"

اِندر سنگھ نے زندگی میں پہلی بار شکار سے مُنہ موڑتے ہوئے کہا ۔۔ "نہیں من بہادر۔ مینوں تو صاحب کا کام کرنا ہے!"

من بہادر نے سچ مچ دوسرے دن میرے گھر ایک مُرغابی بھیجی۔ تین چار دن تک وہ خاموش رہا۔ بلانے پر بھی سیدھے منہ جواب نہ دیتا' لیکن پھر دوبارہ اپنی خوش طبعی پر آ گیا۔ سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ وہ داماد سے انتقام لینے کی بات کو بھول گیا ہے۔ ایک دن اُس نے کہا "امارا سو بہادر اب یہاں آ گیا ہے۔!"

میں نے حیرانی اور اندیشے کے ملے جلے انداز میں پوچھا ۔۔ "کہاں ؟"

وہ "بولا مسن اسکول میں انگریز ساب کے پاس۔ امارے لڑکی کا لڑکی بھی اُس کے ساتھ ہے۔ میں اُسے آج دیکھنے جاتا!"

میں نے سنجیدگی سے کہا "تم اپنا سکاٹ بندوق اور کھکھری میرے پاس رکھ کر جاتا!"

اُس نے کہا "نہیں رکھے گا۔"

میں خاموش ہو گیا۔

دفتر میں یہ بات عام پھیل گئی کہ من بہادر ہر روز شام کو ایک بار مشن سکول جاتا ہے اور رات کو کافی دیر کے بعد واپس آتا ہے۔ اپنی دوہتی کے لیے کبھی تو پھل اور مٹھائیاں لے جاتا ہے اور کبھی کھلونے۔

گوربخش سنگھ نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا "من بہادر سنگھ بہت خطرناک شخص ہے وہ ایک موقعے کی تلاش میں ہے۔ موقع ملتے ہی وہ شو بہادر کا خون کر دے گا، اور پھر قیمہ قیمہ ......"

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اندر سنگھ نے کہا "مینوں پتہ ہوتا تو صاحب کو پہلے ہی کہہ دیتا اسے نوکر نہ رکھو جی صاحب بہادر!"

ایک دن من بہادر کی پنشن کے کاغذات آ گئے۔ من بہادر کا چہرہ کھل اُٹھا۔ ایک بار پھر مرجھائے ہوئے پھولوں میں بہار کی رنگت آ گئی۔ جب وہ پانچ ہزار سات سو روپے کا کیش آرڈر لے کر آ گیا تو اُسے دستخطوں کی شناخت دینے کے لیے گواہی کی ضرورت پڑی۔ باسُو صاحب نے اُسے کہا "من بہادر پوسٹ آفس کی بُک لے لو اور روپیہ جمع کروا دو۔ فضول خرچ نہ کرنا۔ اُدھر بابو سے کہو وہ تمھارے روپے جمع کروا دے گا۔"

لیکن من بہادر میرے پاس نہیں آیا۔

گوربخش سنگھ سے مجھے معلوم ہوا کہ اُس نے بارہ سو روپے خرچ کر کے اپنی ناتن کو سونے کی بالیاں بنوا دی ہیں اور چاندی کے موٹے موٹے کڑے خرید کر دیے ہیں سو دو سو روپے کے کپڑے بھی سلوا لایا ہے۔ کبھی کبھی وہ بازار میں اس چھ برس کی بچّی کے ساتھ دیکھا جاتا، لیکن

شو بہادر کو وہ اب بھی دُور سے دُھتکارتا ہے اور موقع ملنے کی تلاش میں ہے۔ جب وہ اس کا خون کر دے گا.....

میں نے گور بخش سنگھ سے پوچھا "اور باقی کے روپے؟"

اُس نے کہا "وہ اُس نے ٹیک بہادر کے پاس جمع کروا دیے لیکن ٹیک بہادر نے جوئے میں ہار دیے۔!"

ٹیک بہادر شہر کے گورکھوں کا چودھری تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے من بہادر کو بلا کر خوب جھاڑ پلائی۔ اُس نے صرف اتنا کہا "ام کو ٹیک بہادر پر وِسواس ہے۔ وہ رانا کا لڑکا ہوتا!"

اس بات کو ایک ماہ گزر گیا اور میں نے اپنی شادی کے لیے پندرہ دن کی چھٹی لی جب میں واپس آیا تو سب نے مجھے مبارک باد دی، صرف من بہادر میرے پاس نہیں پھٹکا۔ گور بخش سنگھ سے معلوم ہوا کہ اُس کے داماد شو بہادر کو بخار آتا ہے اور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اُسے بھی ٹی بی ہو گئی ہے۔ اور اب من بہادر اسی فکر میں گھلتا جا رہا ہے کہ اگر شو بہادر بیماری سے مر گیا تو وہ اپنے انتقام کی آگ کو کیسے بجھا سکے گا۔۔۔ وہ تین دن میرے سامنے اپنا کام چپ چاپ مستعدی سے کرتا رہا۔ اُس نے مجھے نہ بلایا۔ وہ صبح اکثر دیر سے آتا اور شام کو دفتر بند ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ہی چلا جاتا اور پھر دیر رات تک واپس نہ آتا۔ ایک دن میں نے اُسے خود ہی بلا لیا۔

وہ میرے قریب آ گیا۔

"شکار نہیں گئے؟" مجھے اور کوئی بات نہ سُوجھی۔

وہ نہیں بولا۔

"تمہارا داماد کیسا ہے؟"

وہ بولا "آپ ٹاپ کرے گا۔ بابو جی!"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس دن سے میں نے اُسے بلانا چھوڑ دیا۔

جس دن تنخواہ ملی اُسی دن کلاس فور ایمپلائز یعنی چپڑاسیوں، چوکیداروں کے کوارٹروں میں چوری کی واردات ہو گئی اور چور باقی سامان کے ساتھ ساتھ من بہادر کی ایک نالی

بندوق بھی اُٹھا کر لے گئے۔ گوربخش سنگھ کی بیوی کے سب زیورات چلے گئے۔ اِندر سنگھ کی پورے مہینے کی تنخواہ اور کپڑے بھی چوری ہو گئے۔ سب اُداس تھے لیکن من بہادر کا حال بہت بُرا تھا۔ اس رات خود وہ دفتر کی چوکیداری کی ڈیوٹی پر تھا۔ اس لیے سوائے جسم پر پہنے ہوئے کپڑوں کے اُس کے گھر میں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ تنخواہ کے روپے البتہ اُس کی جیب میں تھے، اِس لیے بچ گئے۔ اُس نے حوالدار کے سامنے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ تنخواہ کے روپے میز پر پھینک دیے اور چیخنے لگا کہ اُسے اُس کی سکاٹ بانڈوق، واپس لا کر دی جائے، نہیں تو وہ مر جائے گا۔ اُسے لوگوں نے بہت سمجھایا۔ باسو صاحب نے تو یہاں تک کہا کہ وہ اُن سے آٹھ سو روپے اُدھار لے کر نئی شاٹ گن خرید سکتا ہے لیکن وہ مٹی میں لوٹنے لگا۔ بڑا دردناک منظر تھا۔ ایک طرف حوالدار کی چارپائی بچھی ہوئی تھی، جس پر بیٹھ کر وہ مختلف لوگوں کے بیانات قلم بند کر رہا تھا۔ دو تین سپاہی کھڑے تھے۔ ایک طرف میری اور باسو صاحب کی کُرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور من بہادر شور مچاتا ہوا زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ آنسوؤں کی وجہ سے اُس کے چہرے پر گیلی مٹی کی ایک تہہ جم گئی تھی۔ کھکھری کمر سے کھُل کر ایک طرف پڑی تھی اور وہ آدھی گورکھالی، آدھی برمی زبان اور آدھی ہندی میں چیخے چلا جا رہا تھا۔ آخر میں حوالدار نے دونوں سپاہیوں کو اشارہ کیا اور انھوں نے اُسے پکڑ کر اُٹھا دیا۔ اِندر سنگھ پانی لے آیا۔ اُسے پانی پلایا گیا تو حوالدار نے اُس سے پوچھا "تمھاری بندوق کون سا میک تھی؟"

وہ بولا "یہ امارا لائسنس بتائے گا، یا اِدھر بابوجی سے پوچھے گا۔ یہ بانڈوق ام کو کپتان ویکفیلڈ بہادر نے انعام میں دیا تھا۔۔۔۔" پھر یکدم آگے بڑھ کر اُس نے حوالدار کے پاؤں پکڑ لیے "کوتوال ساب امارا سکاٹ بانڈوق مل جائے۔ ام کو کچھ اور نئیں چاہیے! ام اُس کو بارہ سال جان ما پھک رکھا ہے!"

اتنے میں سرداری لال بھاگتا ہوا آیا۔ وہ دُور سے ہی کچھ چلّا رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بہادر کی شاٹ گن تھی۔ اُس نے دُور سے ہی کہا "من بہادر کی بندوق اُدھر گھاس میں پڑی تھی۔ شاید چوروں نے بھاگتے ہوئے پھینک دی۔!"

حوالدار اور سپاہی تو اس طرف چوروں کے پاؤں کے نشانات دیکھنے چلے گئے لیکن

من بہادر کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ اُس نے بندوق سرداری لال کے ہاتھ سے چھین لی اور ایک دو لمحے خاموش کھڑا رہا۔ پھر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے ناچنے لگا۔ سب دُوسرے بھی ہنس رہے تھے۔ میری آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو آگئے۔ من بہادر ہنستے ہنستے پھر رونے لگا۔ پھر اُس نے بندوق کو رائفل کی طرح کندھے پر رکھا۔ لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے مارچ کیا۔ پھر باسو صاحب کے سامنے جاکر کھڑا ہوا۔ ایڑیاں ملاکر "پریزنٹ آرمز" کیا۔ اِسی طرح مجھے بھی سیلوٹ کیا اور پھر اپنے کوارٹر کی طرف بھاگ گیا۔

حولدار کے بُلانے پر بھی وہ نہ آیا۔ وہ اپنی گن صاف کرنے میں مصروف تھا۔ ایک پُل تھرو اور تیل کی شیشی اپنے پاس رکھ کر اپنی بندوق صاف کرتے ہوئے وہ کوئی نیپالی یا برمی گانا گا رہا تھا۔

اُس دن وہ پھر شکار کو گیا۔

دوسرے دن گور بخش سنگھ نے بتایا کہ وہ اپنے لائسنس پر چالیس گولیاں خرید کر لایا ہے۔

گور بخش سنگھ کی بیوی نے مسز باسو کو بھی یہ بات بتائی اور ساتھ ہی کہا کہ وہ ایک نئی کھکھری بھی خرید کر لایا ہے۔ اُس کا ارادہ شیو بہادر کو کھکھری سے قتل کرنے کا ہے۔ کیوں کہ شاٹ گن کے کارتوس سے چھرّے جسم میں پھیل جاتے ہیں اور اس طرح شیو بہادر بیان دینے کے لیے زیادہ دیر تک زندہ رہ سکتا ہے۔

مسز باسو نے اُسے بُلایا۔

من بہادر نے کہا "میم ساب! ام تمرا وپھادار کھادم ہے۔ ام بیس برس پولیس میں نوکری کیا۔ امرے ساب کو کبھی کوئی کمپلین نئیں ہلا۔ آپ کو بھی کوئی کمپلین نئیں ملے گا۔ بس!"

مزے کی بات یہ تھی کہ گورکھا برادری کے سبھی لوگ اُس کے ارادے کو جانتے تھے لیکن اس پر بھی کسی نے اُسے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ٹیک بہادر کو ایک دن میں نے دیکھا۔ وہ من بہادر کی کوٹھری میں چارپائی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ من بہادر گلاس ہاتھ میں لیے اُس کے پاؤں کے پاس بیٹھا تھا اور وہ دونوں گورکھالی میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ٹیک بہادر پچاس برس کا ناٹے قد کا گورکھا تھا۔ اُس کی ٹوپی میں مور کے

پر لگے ہوئے تھے اور اُس کے کپڑے بھی صاف اور قیمتی تھے۔

میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اُدھر چلا گیا۔ من بہادر نے مجھے آتے دیکھا تو اُٹھ کھڑا ہوا۔ ٹیک بہادر چپ چاپ بیٹھا چائے پیتا رہا۔ من بہادر کے مُنہ پر ناراضگی کی لکیریں اُبھر آئیں۔

میں نے کہا "من بہادر، اِندر سنگھ کہتا تھا کہ کوارٹروں میں پانی ٹپکتا ہے۔ کہو تمھاری چھت بھی ٹپکتی ہے؟"

وہ دروازے میں میرا راستہ روکے ہوئے کھڑا رہا۔ پھر بولا "نئیں بابوجی!"

"تو مرمّت کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔؟"

وہ پہلے چپ رہا۔ پھر نظر نیچی کیے ہوئے اُس نے فیصلہ کُن آواز میں کہا "تم دیر ہو جائے گا بابوجی!"

مجھے اپنی بے عزّتی ہوتے دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ میں نے کڑے لفظوں میں کہا "تم ابھی دفتر آؤ، من بہادر!"

یہ کہہ کر میں پاؤں پٹختا ہوا لوٹ آیا۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد دفتر میں حاضر ہوا۔

میں نے سختی سے پوچھا "تمھارے کوارٹر میں دوسرا شخص کون تھا آج؟"

وہ بولا "ٹیک بہادر، بابوجی!"

میں نے کہا "وہ آج کے بعد دفتر یا دفتر سے ملحقہ کوارٹروں کی حد میں قدم نہیں رکھے گا۔ سمجھے؟"

وہ چپ رہا۔ صرف سَر ہلا دیا۔ پھر بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے واپس چلا گیا۔

اُس دن کے بعد وہ میرے سامنے بہت کم آتا۔ جب میں دفتر پہنچتا تو وہ میز وغیرہ چپ چاپ صاف کر دیتا۔ وقت پر ٹریننگ سینٹر کی گھنٹی بجا دیتا۔ کبھی کبھی میرے سامنے نہ آنے کی غرض سے وہ اپنی دن کی ڈیوٹی اِندر سنگھ سے بدل لیتا اور رات کو پہرہ دیتا۔ گوربخش سنگھ سے مجھے پتہ چلا کہ اس کا داماد بہت بیمار ہے اور انگریز مشنری نے اُسے سول ہسپتال میں داخل کروا دیا ہے۔ من بہادر اپنی چھ برس کی دوہتی کو قلعے میں اپنے کوارٹر میں لے آیا ہے۔ ایک دن وہ شو بہادر کو دیکھنے ہسپتال گیا۔ لیکن شو بہادر اُسے آتا دیکھ کر ڈر کے مارے بے ہوش

ہو گیا۔ اُس دن کے بعد وہ ہسپتال نہیں گیا۔

اُس کی خاموشی قلعے بھر میں کئی قسم کی افواہوں کا عنوان بن گئی۔ وہ رات کی ڈیوٹی دیتا اور دن بھر اپنی دوہتی کو خوش رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتا۔ کبھی کبھی اُسے اپنے کندھوں پر بٹھا کر قلعے کی سیر کرواتا۔ کبھی بائلر کی آگ دکھاتا۔ کبھی گھوڑا بنتا اور کبھی کبھی بنگالی کی دُکان پر مٹھائی کھلانے کے لیے لے جاتا۔ اِندر سنگھ نے ایک دن کہا کہ اب اُس نے داماد کو مار دینے کا خیال دل سے نکال دیا ہے، لیکن اس کے دوسرے دن ہی سرداری لال نے اُس کی بات کاٹ دی اور کہا کہ لوگوں نے من بہادر کو رات کے وقت بھی ہسپتال کے آس پاس چکر کاٹتے ہوئے دیکھا ہے۔

ایک دن شام کو وہ لڑکی کو ساتھ لے کر ہسپتال چلا گیا۔ قلعے والے نوکروں نے کہا کہ اُس کی دوہتی اپنے باپ کو یاد کر کے بہت روتی تھی۔ من بہادر سے اُس کا رونا نہیں دیکھا گیا اور وہ اُسے اس کے باپ سے مِلانے لے گیا ہے۔ جب وہ دونوں ہسپتال سے واپس آئے تو چھوٹی بچّی اور زیادہ رو رہی تھی۔ من بہادر نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بچّی کا رونا بند ہو گیا۔ اِندر سنگھ کو کچھ اور شک ہوا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب دروازہ کھلا تو اُس نے دیکھا کہ لڑکی من بہادر کے کندھے پر سوار ہے اور من بہادر ناچ ناچ کر بچّی کا دل بہلا رہا ہے۔

کچھ مہینے گذرنے کے بعد گرمیوں کا موسم آگیا۔ ایک دن صبح ہی وہ میرے پاس آگیا۔

"بابوجی! ساب بولا۔ ام کو سو روپیہ پیشگی ملے گا۔"

میرے پاس ٹریننگ سکول کی فیسوں کے پانچ سو روپے تھے، جو میں نے اسی دن جمع کروانے تھے۔ میں نے کہا، "ایڈوانس نہیں مِل سکتا، لیکن تمھیں اِتنے روپوں کی ضرورت کیا پڑ گئی ہے۔؟"

وہ بولا۔ "میں نئیں بتائے گا۔"

میں نے بھی رُوکھے پن سے جواب دیا۔ "جاؤ صاحب سے کہہ دو کہ روپیہ نہیں مِلے گا۔"

وہ کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر سر جھکائے چپ چاپ چلا گیا۔

وہ شام کو ڈیوٹی پر نہیں آیا۔ اِندر سنگھ سے معلوم ہوا کہ ہسپتال چلا گیا ہے۔ سُپروائزر نے ہزاری لال کی ڈیوٹی لگا دی اور رجسٹر میں من بہادر کے نام کے آگے غیر حاضری لگا دی۔

دوسرے دن صبح ہی ڈاکٹر کی ایک چٹ آئی کہ من بہادر چوکیدار ہسپتال میں داخل ہے۔ مسٹر باسو حیران رہ گئے۔ انھوں نے پتہ لگانے کے لیے مجھے ہسپتال بھیجا۔

میں پہنچا تو ڈیوٹی ڈاکٹر نے مجھے کہا "آپ جنرل وارڈ نمبر ۴ میں چلے جائیے۔ وہ بہت کمزور ہو گیا ہے، اُسے خون نہیں دینا چاہیے تھا۔!"

"خون کیوں دیا اُس نے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی اور گورکھا مریض تھا، مر رہا تھا بے چارہ، اور اُس کے گروپ کا خون کہیں نہیں مل رہا تھا۔ جب یہ بوڑھا آیا تو اس کا گروپ میچ کر گیا۔۔۔۔ لیکن ایک تو یہ بوڑھا تھا، دوسرے پہلے ہی بڑا کمزور تھا۔۔۔۔ میں نے بہت منع کیا، لیکن یہ نہیں مانا، رونے لگا اور زمین پر لیٹ کر چیخنے لگا کہ مریض کو بچانے کے لیے اس کا خون لیں۔۔۔۔۔۔ ٹھہریے، میں آپ کو دوسرے مریض کا نام بتاتا ہوں۔۔۔۔" اُس نے ایک رجسٹر دیکھ کر کہا "شو بہادر۔۔۔۔۔ اُس کے پھیپھڑے کا اپریشن ہوا ہے۔"

میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

ڈاکٹر نے کہا "وہ ایک سو پچیس روپے کے انجکشن اور دوسری دوائیاں بھی لایا تھا۔ وہاٹ اے سیکریفائز!"

من بہادر کے پاس پہنچا تو اُس نے کہا "بابو جی! ام اپنا سکاٹ بانڈوق بیچا، اپنا گھکھری بھی بیچ دیا۔ آپ نے بڑشنگی نئیں دیا تو روپیہ اور کوئی نئیں تھا۔ پھن ڈاکٹر بابو بولا۔ کھُون تمرا نئیں لے گا۔ ام نے کہا، کھون ضرور دے گا، نئیں تو رو رو کر مر جائے گا۔۔۔ تو ڈاکٹر بابو مان گیا۔۔۔۔ ام سے اپنی لڑکی رونا نئیں دیکھا گیا۔ ام سو بہادر کو بچا لیا، لڑکی کے لیے۔۔۔۔۔ آپ باسو ساب کو اُمرا بندگی بولے گا اور امری چھٹی لکھے گا تین دن کی!!"

○○

ملنگ اور کمبل

مجھے انگر رمضانی کی خفت اور شرمندگی کا کوئی غم نہیں۔ مجھے غم ہے تو صرف اس بات کا کہ یہ بے عزتی ایک شاعر کی ہوئی ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں، میں خود بھی ایک شاعر ہوں، ایک شاعر کی بے عزتی نے میرے احساس کو شدید چوٹ پہنچائی ہے، اس لیے رگھو ویر صاحب کی دعوت سے واپس آتے ہی میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، ورنہ جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں، مجھے انگر رمضانی کی خفت سے قطعی طور پر کوئی دُکھ نہیں ہوا ہے۔

اسے میں گذشتہ پانچ برسوں سے جانتا ہوں۔ اس سے میری پہلی ملاقات بھی ایک مشاعرے میں ہوئی تھی۔ یہ مشاعرہ ایک ایسی مزدور یونین کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا جو برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی کے قبضے میں تھی۔ میں بھی مدعو تھا۔ کسی کام کی وجہ سے میں تاخیر سے پہنچا۔ جب میں پنڈال میں داخل ہوا تو مبتدی شاعر حضرات اپنا اپنا کلام سُنا چکے تھے اور صاحبِ صدر کسی دُبلے پتلے منحنی سے درویش نُما انسان کا تعارف کروا رہے تھے جو ایک لمبے کُرتے اور پاجامے میں ملبوس تھا۔ جب تک صاحب صدر واپس اپنی نشست پر تشریف لائے، میں سٹیج پر بچھی ہوئی چادر پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ چکا تھا۔ جب اُس درویش صورت شاعر

نے اپنا کلام پڑھنا شروع کیا تو حاضرین ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اس کی آواز میں تمکنت تھی۔ ایک وقار تھا ایک ایسا اوج تھا جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتا ہے۔ حیرت ہوئی کہ اس ڈھائی ہڈی کے ادھیڑ عمر شخص میں اتنی باوقار اور باسلیقہ آواز کہاں چھپی پڑی ہے۔

"ارشاد، ارشاد" کی صداؤں کے درمیان اُس نے اپنی رُباعی پڑھنی شروع کی۔ ایک لمحے کے لیے میں سُن رہ گیا۔ درویش نما شاعر حکمراں جماعت کی پالیسیوں کے خلاف ایک رُباعی پڑھ گیا تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا، سبھی شاعر حضرات بغلیں جھانک رہے تھے۔ صاحبِ صدر کے منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ مہمانِ خصوصی ایک صوبائی وزیر تھے جو سامنے صوفے پر بیٹھے تھے۔ اُن کے منہ پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک رنگ جا رہا تھا۔ میری نظر اُن سب کا طواف کرتی ہوئی پھر مائک پر کھڑے شاعر پر آ کر ٹک گئی۔ شاعر لوگوں کے اس ردِ عمل سے بے خبر دوسری رُباعی بھی پڑھ گیا تھا۔ اس میں سرکار کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے کے لیے لوگوں کو اُکسایا گیا تھا۔ یکایک اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ رُباعی پڑھتے پڑھتے دوسرے مصرعے کے بعد ہی رُک گیا۔ میں نے سوچا اب وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے گا۔ لیکن اُس نے کمال ضبط اور کمال حوصلے سے کام لیا۔ ہاتھ والا کاغذ تہہ کر کے جیب میں رکھا۔ بائیں جیب سے ایک اور کاغذ نکالا اور اعلان کیا "حضرات! معافی کا خواستگار ہوں۔ یہ رُباعیات اپوزیشن کے جلسے کے لیے تھیں، میں غلطی سے پڑھ گیا۔ برسرِ اقتدار پارٹی کے حق میں لکھی گئی رُباعیات بائیں جیب میں تھیں۔ اب میں وہ پڑھوں گا۔"

اور اُس نے جیب سے نکالے ہوئے کاغذ پر لکھی ہوئی رُباعیات پڑھنی شروع کر دیں۔

کچھ لوگ مسکرائے منتظمین نے چین کا سانس لیا، لیکن مائک پر کھڑے شاعر کو ان باتوں کی قطعاً پروا نہیں تھی۔ وہ اسی انداز، اُسی وقار، اُسی تمکنت سے اپنی رُباعیات سُنا رہا تھا۔

یہ میری انگمر رمضانی سے پہلی ملاقات تھی۔

"شراب ..... شراب سے میری نفرت اس شخص کی نفرت سے بھی زیادہ ہے جو شرابیوں کی ایک پوری تباہ شُدہ نسل کا آخری بچا ہوا فرد ہو.....؟" اُس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن

کیا کروں یہ ظالم شے وقتی طور پر سکون دیتی ہے۔ نفرت کرتے ہوئے بھی اس خوب صورت چڑیل کو گلے لگانا پڑتا ہے۔"

جام اُٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جنم جنم کی پیاس اُمڈ پڑی تھی۔

میں چُپ رہا۔

اس نے پھر کہا۔" لیکن میں شراب سے کہیں زیادہ اپنی عزّت کا خیال رکھتا ہوں۔ میں نے کبھی کسی ایسے شخص سے مانگ کر نہیں پی، جس کے دل میں میرے لیے عزّت نہ ہو، یا جو مجھے پلانا نہ چاہتا ہو۔ ایسے پینے سے تو زہر پینا بدرجہا بہتر ہے!"

مجھ پر یقیناً اس بات کا گہرا اثر پڑا۔ میں نے کمرے میں دائیں بائیں دیکھا۔ جالندھر کے ایک رہائشی ہوٹل کا سب سے سستا کمرہ تھا۔ اخگر رمضانی گذشتہ دو برسوں سے اس کمرے میں رہ رہا تھا۔ کمرے میں چاروں طرف خالی بوتلیں، سگرٹوں کے خالی پیکٹ، کتابیں، اخبارات اور رسالے بکھرے پڑے تھے۔ کچھ گوشت اور سالن کی جھوٹی پلیٹیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہاں شاید پچھلے ہفتے کھانا کھانے کے بعد انھیں دھویا نہیں گیا تھا۔ صرف دیواروں پر مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کی تصاویر آویزاں تھیں، جیسے کمرے کی خستہ حالی پر خندہ زن ہوں۔

" زندگی کے لیے شراب کتنی ضروری چیز ہے . . ." وہ پھر بولا۔" میں نے یہ الفاظ اپنی ریاست کے وزیرِ تعلیم سے اُس وقت کہے، جب انھوں نے مجھے ایک محفل میں شراب کی تعریف میں رباعیات پڑھتے ہوئے ٹوکا۔ میں نے کہا۔ وزیر صاحب قبلہ! آپ کیا جانیں کہ ہماری زندگی میں کتنی تلخی ہے۔ زہر کو زہر ہی کاٹتا ہے۔ آپ کے پاس موٹر ہے۔ بنگلہ ہے۔ اپنا پریس ہے۔ وزیر بننے سے پہلے آپ دو اخباروں کے مالک بھی تھے، جو اب آپ کا فرزند چلاتا ہے.... لیکن ہم فقیروں کے پاس کیا ہے؟ یہی لپٹا ہوا کمبل .. بس! لیکن وزیر صاحب قبلہ، ہمارے پاس علم اور فن کا ایک خزانہ ہے جو کبھی خالی نہیں ہوتا، جو آپ کے پاس وزیرِ تعلیم ہونے کے باوجود نہیں ہے...."

بوتل اس مونولاگ کے اختتام سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔

پہلی دو ملاقاتوں نے ہی اخگر رمضانی کا ایک واضح نقشہ میرے ذہن میں پیدا کر دیا تھا۔

اُس کی شخصیت میں کچھ ایسی دل چسپ باتیں تھیں، جو عام آدمیوں میں خال خال ہی ملتی ہیں۔ اس کی باتوں سے کچھ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ زمانے بھر کا ستایا ہوا آدمی ہے۔ ایک بیوی تھی جو کب کی جنت مکانی ہو گئی تھی۔ ایک بچہ تھا جو گم ہو گیا تھا۔ ایک اکیلا، تنِ تنہا درویش صورت، درویش سیرت جسے دنیا سے کوئی لگاؤ نہیں۔ روپے پیسے کی جس کے دل میں کوئی قدر و منزلت نہیں۔ سوائے اس تلخ حقیقت کے کہ شراب پینے کے لیے روپے کی ضرورت پڑتی ہے اور روپیہ بہ حلال کمایا نہیں جاتا مانگنا پڑتا ہے۔ دنیا کی بے ایمانیوں سے بے خبر شاعر، جسے زندگی سے محبت ہے، اور اُس محبت کی خاطر ہی وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ آج کے دَور میں زندہ رہنے کے لیے شراب کس قدر ضروری ہے۔ ویسے جی تو سبھی رہے ہیں۔ دفتر میں کام کرنے والے کلرک لوگ بھی!

اپنی تمام تر درویشانہ عادتوں کے باوجود مشاعروں اور محفلوں کے لیے اُس کی گرسنگی اس قدر شدید تھی کہ میں اُس کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کے بعد بھی سوائے اس کے اور کوئی وجہ تسمیہ اخذ نہ کر سکا کہ زندہ رہنے کے لیے روپے کی ضرورت پڑتی ہے اور روپیہ صرف اسی طرح مل سکتا ہے۔

اخگر رمضانی میرے گھر پہلی بار آیا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں تھیں، چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی، آنکھیں سُرخ تھیں۔

میں نے کہا "تشریف رکھیے، کیسے آنا ہوا؟"

اس نے اپنا کمبل چار پائی پر رکھ دیا۔ بیٹھ کر بولا "شام صاحب! میں وقت کے صحرائے کالا ہاری کی ریت پر مدّتوں سے چلتا آ رہا ہوں۔ اب چھالوں سے تپکتے ہوئے تلوے لیے اس جگہ پہنچا ہوں جہاں سے دو راستے الگ ہوتے ہیں۔ آپ بتائیے میں کون سا راستہ اختیار کروں!"

مجھ پر اُس کی بے چارگی نے گہرا اثر کیا۔ میں نے پوچھا "بات کیا ہے؟"

وہ دانت کٹکٹاتا ہوا بولا "امریکن پونجی سے فنکار اور شاعر خریدے جا رہے ہیں۔ مجھے بھی دعوت دی گئی ہے۔ میں زندگی بھر کی شراب کے لیے کمائی صرف ایک برس میں کر سکتا ہوں!"

میں چپ رہا۔

وہ بولا "میں آپ جیسے دوستوں کے دروازے پر پڑا رہوں گا۔ دشمنوں سے بھی مانگ کر پی لوں گا۔

سوشلسٹوں سے کانگریس کو اور کانگریس سے جن سنگھ کو لڑا کر اپنا مطلب نکال لوں گا، لیکن اپنا ضمیر نہیں بیچوں گا!"

میں بہت متاثر ہوا۔ میں نے کہا" آپ نے درست فیصلہ کیا ہے۔ آپ کی جگہ پر کوئی اور ہوتا تو یقیناً اُس کے پاؤں لڑکھڑا جاتے اور وہ بہک جاتا۔"

یوں ہی کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ امریکن سرمایے سے تشکیل کی ہوئی ایک نام نہاد جمہوری سوسائٹی کے لوگ اُس کے پاس شراب کی کچھ بوتلیں لائے تھے۔ بوتلیں اُس نے کمال ہوشیاری سے اپنی الماری میں رکھ لی تھیں اور سوسائٹی کی رُکنیت کے لیے اُنھیں آیندہ کے وعدے پر ٹرخا دیا تھا۔ باتوں باتوں میں میرے دفتر جانے کا وقت ہو گیا۔ میں نے اجازت چاہی اور کہا" آپ اگر چاہیں تو یہاں ٹھہر سکتے ہیں، میرے دفتر کا وقت ہو گیا ہے۔!"

وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا — "نہیں قبلہ، مجھے تو جانا ہی ہے..... ہاں، آپ کو ایک تکلیف دے رہا ہوں۔ آپ کے پاس اگر ایک سو روپے ہوں تو دینے کی زحمت گوارا کریں۔ میں کنڈا گھاٹ جا رہا ہوں۔ رات جیب میں جتنے روپے تھے ایک دوست کو دے دیے.... یہاں سے جاتے ہی منی آرڈر بھجوا دوں گا...... اور اگر ممکن ہو تو مجھے ایک کمبل بھی عنایت کیجیے۔ یہ پُرانا کمبل پتلا سا ہے اور آپ تو جانتے ہیں کنڈا گھاٹ میں کتنی کڑاکے کی سردی پڑتی ہے۔ کمبل بھی واپسی پر لوٹا دوں گا۔"

غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لیے! میں نے سوچا۔ ایک ہی کمبل تھا گھر میں۔ وہ لا کر پیش کر دیا۔ گھر کی ساری کھرچن، بہ معہ باورچی خانے میں رکھے ہوئے ریزگاری کے ڈبے کے سکّے، اکٹھی کی تو بہ مشکل ساٹھ روپے بنے۔ جاتے ہوئے اس نے پھر تسلّی دی" فکر نہ کریں، میں واپسی پر روپے اور کمبل دونوں لوٹا دوں گا۔"

اور واقعی ایک دوپہر کو جب میری جیب میں صرف ایک روپیہ تھا، مجھے اس کا ساٹھ روپے کا منی آرڈر مل گیا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں اپنی دانست میں ساٹھ روپے اُسے ہمیشہ کے لیے دے چکا تھا اور اُس کے حالات ایسے تھے کہ روپے واپس آنے کی کوئی اُمید ہو سکتی اور نہ ہی گنجائش تھی۔

انبالہ کے ایک مشاعرے میں وہ پھر مجھے ملا۔ اُس کے ساتھ کچھ نوجوان شاعر بھی تھے۔ ان میں سے ہر ایک بیش قیمت کپڑوں میں ملبوس تھا، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ سبھی خوش حال گھرانوں سے

تعلق رکھتے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد اخگر کے لیے سگریٹ، پان، شراب لا رہے تھے۔ مشاعرے میں اُن سب نے بھی رُباعیات پڑھیں، جو یقیناً اچھی تھیں۔ اگر اخگر نے خود لکھ کر نہیں دی تھیں تو اس نے یقیناً اصلاح سے اُن کی نوک پلک سنواری تھی۔

مشاعرہ ختم ہونے پر میں بھی سب کے ساتھ شاعروں کی قیام گاہ پر گیا۔ شراب کا دَور چلا۔ شاگردوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بھر بھر کر جام پیش کیے ـــ "مشاعرہ بہت اچھا رہا۔" اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "صرف ایک چیز کی کمی تھی۔ یہاں کے لوگ بہت کورذوق ہیں۔ اب دیکھیے اُلفت صاحب کو کلام سُناتے ہوئے اس لیے داد نہیں مل سکی کہ اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے..... ورنہ اُن کا کلام تو غضب کا تھا!" اُس نے کنکھیوں سے اُلفت صاحب کی طرف دیکھا، جو شرم سے پانی پانی ہوئے جا رہے تھے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ اُلفت صاحب نے شاید اُن کی شاگردی کا دَم بھرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ خود شعر کہہ سکتے تھے، لیکن ان دنوں مشاعروں میں اخگر کا طوطی بولتا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے بغیر دعوت نامہ ملے بھی خود آتا اور دو چار دیگر شاعروں کو ساتھ لاتا۔ اُن کے معاوضے سے نصف حصّہ خود وصول کر لیتا، لیکن بڑے سلیقے سے۔ مجھے بھی ایک بار اس بات سے دو چار ہونا پڑا۔ چلنے سے پہلے وہ مجھے الگ لے گیا ـــ "وہ شام صاحب! آپ کے پاس کچھ روپے ہوں گے؟"

"ہاں....." میں نے کہا ـــ "اخگر صاحب، کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"صاحب، چالیس روپے یہاں سے ملے تھے۔ رات نشے میں ایک رکشا والا لے کر چمپت ہو گیا۔ اب یہ بات کسی سے کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ آپ بیس روپے دے دیجیے۔ چند دنوں کے اندر ہی آپ کو مل جائیں گے۔"

میں نے اُسے بیس روپے دیے۔ اُس نے جاتے ہوئے شکریے کے طور پر میرا ہاتھ دبایا۔

گاڑی میں حُسنِ اتفاق سے میں نے ایک اور شاعر دوست سے اخگر کی اس لاپروائی کا ذکر کیا کہ کیسے رکشے والے کے ہاتھ چالیس روپے گنوا بیٹھا ہے تو پتا چلا کہ وہ دوست بھی بیس روپے سے کم میں نہیں چھوٹے ہیں۔ ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی آیا۔ اخگر کے بارے میں قایم کیا ہوا نقشہ اب

آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔

انبالہ سے واپس آنے کے تیسرے دن بعد مجھے اس کی ایک چِٹھی ملی جس میں میری شخصیت اور میرے کلام کی خوب تعریف کی گئی تھی۔ خط کے ساتھ ایک فارسی شعر بھی تھا، جو میرے نام کی مناسبت سے لکھا گیا تھا، جس کا مطلب کچھ یوں تھا۔ ''بے وفا دوستوں سے بھرے ہوئے اس کھنڈر نما شہر میں تم ہی ایک اکیلے دوست ہو جو لق و دق صحرا میں کسی سایہ دار درخت کی طرح ہے۔''

میں مسکرا اُٹھا۔ سوچا، یہی شعر کئی اور دوستوں کو بھی بیس روپے کے قرض کے عوض اسی ڈاک سے ملا ہوگا۔

آنگر کے بارے میں خبریں ملتی رہیں۔ آج انبالہ میں ہے تو کل سری نگر، پرسوں شملہ میں تو اُس سے اگلے دن دہلی میں۔ اخباروں میں مشاعروں اور اُردو کانفرنسوں کے بارے میں خبریں چھپتیں تو دیگر بڑے بڑے ناموں کے ساتھ اس کا نام بھی جلی حروف میں چھپتا۔

ایک دن دفتر سے آیا تو معلوم ہوا کہ پچیس روپے کا وی پی پارسل آیا ہے۔ آنگر کی نئی کتاب تھی، اور ساتھ میں ایک خط بھی تھا۔ ''زندگی سے گھبرا گیا ہوں۔ عمر بھر کی کمائی اس کتاب کی طباعت میں لگ گئی۔ اب ان بکھرے ہوئے روپوں کو چننے کی تگ و دو کر رہا ہوں۔ آپ کی مدد کے لیے پیشگی شکریہ۔''

کتاب گھٹیا نیوز پرنٹ پر چھپی ہوئی تھی۔ ٹائٹل کے اندر والے صفحے پر ''وزیر تعلیم پنجاب کے نام'' معنون تھا۔ کتاب کا دیباچہ آنگر کے بہترین دوست روزنامہ ''آپ'' کے مدیر رگھوبیر صاحب نے تحریر کیا تھا جس میں مثالوں کے توسط سے اسے شیلے، کیٹس اور ورڈزورتھ سے بھی بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں پڑھتا رہا اور مسکراتا رہا۔

ہر صفحے پر کسی نہ کسی رباعی کا حوالہ دے کر حاشیے میں کچھ اس قسم کی عبارت تھی :۔

''امید ہے رائے بہادر چونی لال میری اس رُباعی سے متفق ہوں گے۔''

''یہ رُباعی قوم کے زندہ شہید لالہ ولایتی رام گھی والے امرتسر کے نامِ نامی سے معنون کرتا ہوں۔''

ایک دوست نے بتایا کہ جو پچاس ساٹھ نام رُباعیوں کی شانِ نزول کے طور پر ساتھ چھپے ہیں، اُن میں سے ہر شخص نے دو سے لے کر پچیس جلدوں تک کے روپے دیے ہیں۔ ایک اور دوست نے بتایا کہ کتاب کی جو چند سو جلدیں ایک پڑوسی صوبے میں بکنے کے لیے بھیجی گئی ہیں۔ وہ وہاں کے وزیر تعلیم کے نام معنون ہیں اور کشمیر میں بکنے والی جلدوں پر شیخ عبداللہ کا نام ہے۔ میں

نے اپنی پاکٹ ڈائری میں بیس جمع پچیس، میزان پینتالیس روپے اُس کے نام کے سامنے لکھ دیے۔

بڑے دنوں کی چھٹیوں میں سردی سے کانپتا ہوا انگر رمضانی پھر آپہنچا۔ میں گھر پر نہیں تھا اُسے بٹھایا گیا۔ چائے پانی کے لیے پوچھا گیا۔ جب میں شام کو لوٹا تو وہ میرے کمرے میں میرے بستر پر سو رہا تھا۔ گھر والوں نے کہا کہ اُس نے آتے ہی کچھ روپے مانگے تھے لیکن انھوں نے میری غیر حاضری میں ٹال مٹول کر کے اُسے میرا انتظار کرنے کی رائے دی تھی۔ میں نے دیکھا میرا دیا ہوا کمبل اُس نے اپنے تھیلے کے ساتھ تپائی پر رکھ دیا تھا۔ کمبل جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔

بیدار ہونے پر اُس نے بیمار آنکھوں سے مجھے گھورا۔ معافی چاہتے ہوئے وہ بولا "شام صاحب آپ کو ایک تکلیف دینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

میں خاموش رہا۔

"بات یہ ہے کہ روزانہ "آپ" کے رگھوبیر صاحب سے میری کچھ اَن بَن ہو گئی ہے۔ مجھے اُن کے خلاف کچھ پوسٹر چھپوانے ہیں ......"

میں نے کہا "رگھوبیر صاحب سے تو آپ کے تعلقات بہت خوش گوار تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اخباری دنیا میں صرف وہی آپ کی امداد کیا کرتے تھے تو غلط نہ ہوگا۔"

انگر نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "آپ کیا جانیں شام صاحب اُن کی عادتیں! بس یوں سمجھیے کہ میرے لیے تو آج زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اُن کے خلاف پوسٹر چھپوانا! مجھے صرف ایک سو روپے کی ضرورت ہے!"

میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے انگر صاحب۔ میں صرف پانچ سو روپے تنخواہ لیتا ہوں، اور آپ پہلے بھی روپے لے جا چکے ہیں۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "مجبوری بہر حال مجبوری ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ دنیا جینے نہیں دیتی شام صاحب! آپ زندگی میں جم چکے ہیں۔ ہم لوگوں کی زندگی دیکھیے۔ ہم فقیر تباہ حال درویش لوگ ہیں..... ہاں آپ رگھوبیر کی دعوت پر تو جائیں گے ہی اگلے ہفتے!"

میں نے کہا "مجھے دعوت نامہ مل چکا ہے!"

"تو وہیں ملاقات ہوگی!" اُس نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ میں حیران رہ گیا۔ ابھی ابھی تو

رگھوبیر صاحب کے خلاف پوسٹر چھپوانے کی بات ہو رہی تھی، اور اب اُن کی دعوت میں شرکت کا ارادہ بھی ہے۔

کچھ دنوں کے بعد واقعی شہر کی دیوار پر رگھوبیر، پروپرائٹر اور اڈیٹر ان چیف ڈیلی "آپ" کے خلاف پوسٹر لگ گئے اور میری حیرانی کی حد نہ رہی جب دعوت والے دن میں نے اخگر کو بھی رگھوبیر کے ہاں بیٹھے دیکھا۔ رگھوبیر صاحب کے ساتھ اُس دن صوبائی سرکار کا کوئی وزیر بھی تھا۔

باتیں ہوتی رہیں۔ رگھوبیر صاحب نے وزیر کے ساتھ سب شاعروں، ادیبوں اور اخبار نویسوں کا تعارف کروایا۔ میں نے غور کیا۔ وہ اخگر رمضانی کے پاس سے چُپ چاپ گذر گئے۔ ناراضگی بدستور تھی۔ پھر اخگر کی وہاں موجودگی کا راز کیا ہے؟ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔

وزیر کے چلے جانے کے بعد وسکی کا دَور چلا۔ باتوں کا شور بڑھ گیا۔ لطیفے، قہقہے، شعر اور جام اُچھلنے لگے اور ان سب کے ساتھ ساتھ گاہے بگاہے پگڑی بھی اُچھلنے لگی، تو میں نے سرور کی حالت میں ذرا اونچی آواز میں کہا۔ "اخگر صاحب، آپ خاموش کیوں بیٹھے ہیں؟"

اخگر نے بوتل میں سے وسکی اپنے گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ "شام صاحب، کیا عرض کریں، کوئی سننے کے لائق بھی تو ہو۔ سبھی کور ذوق ہیں اور خود کو مدیر کہتے ہیں۔"

میں نے پھر لقمہ دیا۔ "رگھوبیر صاحب سے ڈر لگتا ہے کیا؟"

اُس نے پھر کڑک کر کہا۔ "کون ڈرتا ہے ان ٹکئی اڈیٹروں سے!"

رگھوبیر صاحب کے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے غور کیا۔ انھوں نے اُسے گھور کر دیکھا۔ اخگر نے پھر کہا۔ "یہ سرمایہ دار اخباروں کے مالک نہ جانے خود کو کیا سمجھتے ہیں!"

رگھوبیر صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کڑک کر کہا۔ "اخگر صاحب، آپ باہر تشریف لے جائیں۔"

اخگر نے کھڑے ہو کر کہا۔ "یہ میری بے عزّتی ہے۔ سب شاعروں کی بے عزّتی ہے۔ اگر آپ نے کچھ کہا تو سبھی اُٹھ کر چلے جائیں گے۔!"

لمحہ بھر کے لیے رگھوبیر صاحب لڑکھڑا گئے۔ پھر انھوں نے کہا۔ "یہ گھر میرا ہے، یہ بوتلیں میری ہیں۔ ان دوستوں کو میں نے مدعو کیا ہے۔ آپ کو کسی نے نہیں بُلایا۔ آپ ازراہِ کرم تشریف لے جائیں، ورنہ مجھے نوکروں سے کہنا پڑے گا۔!"

اکنگر نے اِدھر اُدھر دیکھا — سب کی نظریں اپنی اپنی پلیٹوں یا گلاسوں پر مرکوز تھیں — !
اُس کے چہرے پر بے چارگی نے تانا بانا سا بُن دیا۔ وہ ایک لمحے میں ہی دس برس بوڑھا ہوگیا۔
اُس نے اپنا کمبل اُٹھایا اور چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ سب دَم سادھے بیٹھے تھے۔ دروازے
کے پاس پہنچ کر وہ رُکا، ٹھٹھکا اور پھر لَوٹ آیا۔

اپنی کرسی کے پاس آکر اُس نے اپنے آدھے بھرے ہوئے گلاس کی طرف دیکھا، پھر
نیچی نظروں سے رگھوبیر صاحب کی طرف دیکھا، رگھوبیر صاحب نے منہ پھیر لیا — اُس نے جام
اُٹھایا، ایک ہی سانس میں پی گیا۔ پی کر اُس نے کمبل سے منہ پونچھا اور پھر بھاری قدموں سے چلتا
ہوا باہر نکل گیا۔

جاتے ہوئے وہ یوں لگ رہا تھا جیسے کمبل کو ٹانگیں لگ گئی ہوں۔

○○

بھولے ناتھ

لڑکا چھوٹا سا تھا۔

اُس کے ہاتھ میں، ہاتھ سے بھی بڑی گھنٹی تھی۔ دائیں بائیں کانوں پر اور سامنے ماتھے پر لٹکتی پیتل کی چھوٹی چھوٹی کٹوریاں تھیں۔ جن میں ایک ایک گھنگھرو لٹک رہا تھا۔ سر پر پیتل ہی کا کلش تھا۔ کلش میں مور کے پر پروئے ہوئے تھے جو ہوا میں لہرا رہے تھے۔ جب وہ سر ہلاتا تو کانوں پر لٹکتی ہوئی کٹوریاں ایک سُریلی آواز میں بج اُٹھتیں۔ جب وہ ہاتھ کی بڑی گھنٹی بجاتا تو گھنٹیوں کی آوازیں خلط ملط ہو کر ایک سُریلا راگ پیدا کر دیتیں ـــــ لڑکے کی عمر یہی تیرہ چودہ برس تھی، لیکن دیکھنے میں وہ دس برس سے زیادہ کا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چہرے پر بچپن کی سُرخی ضرور تھی، لیکن یہ سُرخی دھوپ کی تمازت سے جل کر سیاہ ہو گئی تھی۔ تازگی اور معصومیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں لیکن بچپن کی شوخی سے بالکل عاری تھیں۔ اس کا بایاں ہاتھ ایک ہی تال اور ایک ہی لے میں گھنٹی بجانے لگا اور ساتھ ہی اُس کے مُنہ سے شِو اور پاربتی کے بیاہ کی گاتھا کے بول نکلے:

جٹا دھار کیلاش سے آیا
گوراں سُندر روپ سجایا

ناگ گلے میں گہنے پہنے
لاکھ بھبھوت کے چیت کہنے

شو بھولے بھنڈار بھریں گے!
کھٹن کمان والے جیتے رہیں گے

شو پاربتی کے بیاہ کی گاتھا کتنی صدیاں پرانی تھی، اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ شو کون تھا، پاربتی کون تھی۔ شاید اس کے ذہن کے کسی کونے میں شبیہہ ابھرتی ہو، لیکن گاتھا کے بول تو اسے ماں کے دودھ کے ساتھ ملے تھے اور انھیں گانا اس کے لیے اتنا ہی فطری فعل تھا، جیسے چلنا یا اٹھنا بیٹھنا۔ گاتے گاتے وہ ادرگرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نکل پالش اور خراد کی مشینوں کی آواز بھی ایک ہی لے اور سُرتال میں آرہی تھی۔ کارخانہ کوئی خاص بڑا نہیں تھا۔ بس سڑک کے کنارے ہی ایک شیڈ تھا جس میں پُرزے بن بھی رہے تھے اور نکل پالش کا کام بھی ہو رہا تھا۔ ایک کونے میں اس کے ہم عمر لڑکے میلے داغدار کپڑے پہنے، بُنے ہوئے پرزوں پر لکڑی کا بُرادہ مل مل کر انھیں چمکا رہے تھے۔ کچھ لڑکے گریس لگے سلائی مشین کے چکروں کو ریگ مار سے رگڑ رہے تھے۔ بھورے بالوں والا خوب صورت لڑکا لگاتار چولھے پر ابلتی ہوئی سریش کو ایک کھونچے سے ہلائے جا رہا تھا۔ چاروں طرف کام کی گہما گہمی۔ کسی کو بھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔

شو بھولے کی بیاہ کی گاتھا میں اب وہ اس حصّے تک پہنچ چکا تھا جہاں پاربتی کو اس کی سہیلیاں طعنے دیتی ہیں کہ اس کا ہونے والا پتی سانپوں، بھبھوت، کیڑے مکوڑوں اور زہر کے ماحول میں رہتا ہے، ایسے پتی کے ساتھ وہ کیسے نباہ کر سکے گی۔ یہ لوک گاتھا کا میانی حصّہ تھا۔ بہت سے لوگ اسے ایک پیسہ دو پیسے دے کر جلدی اسے چلتا کر دیتے تھے اور اسے اس حصّے تک پہنچنے کی نوبت شاذ ہی آتی تھی، لیکن اس بازار میں جہاں چاروں طرف کارخانے ہی کارخانے تھے وہ پہلی بار آیا تھا۔ جب وہ دروازے پر پہنچا تو اس کی گھنٹی کی پہلی آواز سے کچھ چہرے اس کی طرف اٹھے تھے۔ کچھ ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ کچھ آنکھوں نے سکڑ کر اسے گھورا تھا۔ ایک منچلے لڑکے نے تو نفرت سے ناک سکوڑ کر زمین پر تھوکا بھی تھا۔ صرف بھٹی کے قریب بیٹھے بھوری آنکھوں اور سنہرے بالوں والے لڑکے نے ایک نظر اس پر ڈال کر بڑی ہی پیاری مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا تھا۔

وہ اُسی طرح گائے جا رہا تھا۔ شوبھولے کے بیاہ کی گاتھا ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ آخری دعائیہ دوہوں کو پڑھ رہا تھا۔ جن میں دان دینے والوں کی گایوں اور ڈھور ڈنگروں میں افزائش کی دعائیں دی گئی تھیں۔ اس کے کاروبار میں ترقی کے وردان تھے اور اُس کے بیٹوں، پوتوں، پڑپوتوں تک پھولنے پھلنے کی کامنا کی گئی تھی — "مالکوں کے بالکے جیتے رہیں گے۔۔۔۔ گایوں کے بچھڑے بڑھتے رہیں گے۔۔۔۔۔۔ دھن کے بھنڈار بھرے رہیں گے۔۔۔۔"

کونے کی میز پر مشینوں اور بھٹیوں سے دُور بیٹھے ہوئے سردار جی نے ایک بار کھانس کر گلا صاف کیا۔ ناک سے عینک اوپر اُٹھا کر اُسے گھورا اور پھر جیب سے دس پیسے کا سِکّہ نکال کر اس کی طرف پھینک دیا۔

سِکّہ ایک جھنکار کرتا ہوا اس کے پاؤں کے پاس گرا۔ ایک بار پھر سب کے چہرے اُس کی طرف اُٹھ گئے۔ وہ ایک لمحہ جھجکا اور اُس کا چھوٹا سا منہ یکبارگی کھُل گیا۔ اکثر وہ بھکشا کا سِکّہ اپنی گھنٹی آگے بڑھا کر اور اُسے سیدھے مُنہ رکھ کر اُس میں لیا کرتا تھا۔ زمین سے سکّہ اُٹھانا اُس کے اصول کے منافی تھا۔ آخر وہ بھک منگا نہیں تھا، سادھو تھا، شوبھولے کا بیاہ پڑھنے والا 'جمک'، تھا۔ بھکشا لینا اُس کے لیے اپنا حق لینے کے برابر تھا اور وہ یہ حق اپنے آبائی غرور اور پیشہ ورانہ عزّت کی قیمت پر وصول نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات اُس کے بچکانہ ذہن میں اُس کے ماں باپ اور بزرگوں نے کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی کہ بھکشا کا سِکّہ گھنٹی میں ہی لیا جا سکتا ہے، زمین سے اٹھا کر نہیں۔ لیکن کئی دنوں سے وہ روپے دو روپے سے زیادہ نہیں بنا سکا تھا اور ڈیرے پر اُس کی ماں اُسے روز کوستی تھی۔ اس نے دو اصول توڑے، جُوتی اُتارے بغیر، اُٹھتی ہوئی نظروں سے ڈرتے، جھجکتے، سمٹتے ہوئے وہ جھکا اور اُس نے سِکّہ اُٹھا لیا۔

کوئی ہنسا۔

سِکّہ اُٹھاتے ہوئے اُس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ نظریں اُٹھا کر دیکھے، گھنٹی کو بائیں ہاتھ میں پکڑے سِکّے کو دائیں مٹھی میں دبائے وہ جلدی سے باہر نکل آیا۔

جھڑکیاں اُس نے پہلے بھی کھائی تھیں۔ کئی لوگوں نے پیسے دینے کے بجائے اُس کے مُنہ پر ہی اُسے چور، نکمّا کہہ کر بھی پکارا تھا، لیکن آج جیسی بے عزّتی اُس کی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی، اپنے ہم عمر کاریگر لڑکوں کی خاموش پھٹکار نے ایک بار اُسے جھنجھوڑ دیا تھا۔ اپنی چھوٹی سی زندگی میں یہ پہلا

موقع تھا، جب اُس نے اپنی جُوتی اُتارے بغیر پیسہ لیا تھا اور وہ بھی زمین سے اُٹھا کر.... اُسے خود سے نفرت سی ہونے لگی. اُسے اس چھوٹے بچّے کی یاد آگئی جس نے کچھ دن پہلے اُسے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر اپنی ماں سے کہا تھا "ممّی بڑے ہوکر ہم بھی اس جیسے بنیں گے" اور ماں نے اپنے بچّے کو گود میں لیتے ہوئے اُس کی طرف نفرت انگیز نگاہوں سے دیکھا تھا اور اپنے بچّے کو جھڑکی دی تھی "اس جیسا بنے گا مُنّے؟ چل دوڑ جاکر اسے بھیک دے آ. اور کہنا، کچھ کام کرو بابا. مانگ کر کھاتے ہوئے شرم نہیں آتی کیا؟ تم لُولے لنگڑے تو نہیں ہو!" اور جب بچّے نے پیسے دیتے ہوئے طوطے کی طرح رٹا رٹایا فقرا دہرا دیا تھا تو وہ جیسے زمین میں دھنس گیا تھا. تب اُس کی رُوح ابھی معصوم تھی. اُس پہ دنیا کے رنگ اثر انداز نہیں ہوئے تھے لیکن یہ آج کی چوٹ؟ اُس کے لیے اور آگے جانا مشکل ہوگیا اور اُس کے قدم خود بہ خود اپنے گھر کی طرف اُٹھنے لگے۔

ڈیرے پر پہنچ کر اس نے اپنی ماں سے بیماری کا بہانہ کیا اور چٹائی پر لیٹ گیا. اُس کے دونوں بڑے بھائی ابھی تک نہیں آئے تھے. ماں نے گڑ کا شربت بنا کر اُس کے سامنے رکھا، جو اُس نے پی لیا. وہ شام تک گُم سُم لیٹا رہا. اُس کی ماں پھر اُس کے پاس آکر بیٹھ گئی. بھولے نے چونک کر کہا.. ماں! اگر کوئی بھکشا لینے نہ جائے تو؟"

ماں نے اُس کی طرف فکرمندانہ نظروں سے دیکھا. یہ لڑکا شروع سے ہی کچھ عجیب سا تھا.

"کیا کہتا ہے رے؟"

"ماں ـــ" اُس نے پھر کہا" بھکشا نہ لے اور کام کرکے پیسہ لے تو.....؟"

"ایسا آدمی کرمی نہیں ہوگا رے.... بھکشا لینا اور شمو پاربتی کی استت کرنا ہمارا کرم ہے...."

اُس کی ماں نے کہا اور پھر چولھے پر چڑھی ہانڈی کو دیکھنے کے لیے اُٹھ گئی۔

کرمی نہیں ہوگا! اُس نے سوچا، جو شورا تری کو تین راتیں جاگے گا نہیں وہ کرمی نہیں ہوگا۔ جو بھنگ نہیں پیے گا وہ کرمی نہیں ہوگا، جو جُوتی اتار کر پیسہ نہیں لے گا، وہ کرمی نہیں ہوگا. آخر کرمی ہوتا کیا ہے؟

اُس نے وہیں سے لیٹے لیٹے پکارا ـــ "ماں، جو لڑکے نگر میں کام کرکے پیسے کماتے ہیں. وہ کرمی نہیں ہیں کیا؟"

"اُن کا کرم کام کرکے پیسے کمانا ہے بھولا، تیرا کرم بھکشا لے کر پیسے لانا ہے. سمجھے۔" ماں نے

پھر کہا۔

عجیب بات تھی۔ اُس نے بھیک اور بھکشا میں ہمیشہ فرق سمجھا تھا۔ بھیک تو وہ لیتے ہیں جو اَدھ مرے اور لُولے لنگڑے ہوتے ہیں جو ریلوے کے پُل پر بیٹھتے ہیں اور کہتے ہیں ایک پیسہ دے جا بابا! اور بھکشا سادھو لوگ لیتے ہیں جن کا کرم ہی یہی ہے...... لیکن مانگتے تو بھی ہیں نا! پھر فرق کیا ہے؟

وہ کتنی ہی دیر لیٹا رہا۔ جب اُس کے دونوں بھائی آ گئے، اور انھوں نے پانچ پیسے، دس پیسے اور بیس پیسے کے سکّے گن کر اعلان کیا کہ ان دونوں کی ملا کر رقم چھے روپے ستّر پیسے ہے تو بھی وہ لیٹا رہا اور جب وہ دونوں اُس سے بات کیے بغیر لیٹ گئے اور سو گئے تو وہ کافی دیر تک اُدھیڑ بن میں رہا اور اُسے نیند نہ آئی ـــ ماں نے کھانے سے پہلے اُس کے لیے پکائی ہوئی کھچڑی اُسے دی۔ اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پھر کہا ـــ "تمھیں بخار تو بالکل نہیں ہے۔ پر جب آیا تھا تو بنڈا گرم تھا!"

اُس وقت اُس کا بخار اُتر چکا تھا کیوں کہ وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

صبح وہ کافی دن چڑھے اُٹھا۔ شوآرتی سے فارغ ہو کر اس نے کھانا کھایا۔ روز کی طرح کپڑے پہنے، کلش اور کٹوریاں لگائیں، گھنٹی لگائی اور چل پڑا۔ بجائے شہر کی طرف جانے کے وہ باہر نہر کی طرف نکل گیا۔ کنارے پر ایک جگہ کھڑے ہو کر اُس نے کلش، کٹوریاں اور گھنٹی اُتار کر ایک جھاڑی کے پیچھے چھپا دیں اور پھر خرادیوں کے بازار کی طرف چل پڑا۔

خراد کے کارخانے میں داخل ہوتے ہوئے اُسے بالکل یہ احساس نہیں تھا کہ اُسے اتنی جلدی کام مل جائے گا، لیکن جب ہڈیوں کے ڈھانچے کی طرح دُبلے پتلے بابو نے اُس کا نام پوچھ کر چار روپے روز پر اُسے بھٹّی کے سامنے بٹھا دیا تو اُسے یہ سب کچھ ایک خواب سا لگا۔

مشینوں پر پُرزے کاٹے چھانٹے جا رہے تھے۔ ایک طرف کچھ لڑکے لکڑی کا بُرادہ مل مل کر میلے پرزوں کو چمکا رہے تھے۔ ایک طرف آہستہ آہستہ گنگناتا ہوا ایک لڑکا پیتل کے باریک چھلکوں کو تپتی ہوئی کڑاہی میں ڈال رہا تھا۔ کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ کی۔ کوئی اس سے بول نہیں رہا تھا۔ سبھی اپنے کام میں مصروف تھے۔

کام! یہ اُس کے لیے ایک نئی بات تھی۔ شاید ایک نئی زندگی کی شروعات ـــ

گھنٹی بجانے والے سست ہاتھ بہت جلد تھک گئے۔ پیشانی گرمی سے دہک اٹھی، اُس پر پسینے کے قطرے جھلملا اُٹھے۔ وہ پہلے آدھ گھنٹے میں ہی پانی پینے کے لیے دو بار اُٹھا۔ گرم بھٹی کے سامنے سے اُٹھ کر گھڑے کا ٹھنڈا پانی پینے سے اُسے اپنا گلا دُکھتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ پھر بھی کام میں مگن رہا۔ کھولتے ہوئے پیتل کے لاوے کو بڑے بڑے چمٹوں کی مدد سے بھٹی پر اُتارتا چڑھاتا رہا۔ ایک دو بار دُبلا پتلا بابو اُس کے سر پر آکھڑا ہوا۔ لیکن اُسے کام کرتا دیکھ کر ہٹ گیا۔ دوپہر ایک بجے دو گھنٹوں کی چھٹی ہوئی۔ وہ بھی باہر نکل آیا۔ کام کرتے کرتے اُس کی بھوک خوب چمک اُٹھی تھی۔ ماں نے جو ستّو باندھ دیے تھے اس نے ایک گلاس میں بھگو کر اور گُڑ ڈال کر کھا لیے اور پھر چبوترے پر کارخانے کے دروازے کے باہر لیٹ گیا۔

اس نے سوچا، اُس کے دونوں بھائی اس وقت بھی شو پاربتی کا بیاہ گا رہے ہوں گے۔ گھنٹی آگے بڑھا کر، جوتی اُتار کر، پیسے لے رہے ہوں گے۔ کئی لوگوں نے انھیں دُھتکارا ہوگا، چور اُچکا کہا ہوگا، محنت کرنے کی صلاح دی ہوگی۔ کئی لوگوں نے ہاتھ جوڑ کر بڑے طنز آمیز لہجے میں "معاف کرو بابا" کہا ہوگا۔ کئی لوگوں نے نفرت سے منہ پھیر کر زمین پر تھوکا ہوگا۔ اس وقت اُسے بہت ذہنی تسکین کا احساس ہوا کہ کم از کم اب وہ ان کی طرح نہیں ہے۔ وہ مانگ کر پیٹ نہیں بھر رہا ہے۔ شام کو اُسے چار روپے ملیں گے۔ ندی کنارے سے وہ اپنا سامان اٹھا کر اسی لباس میں گھر پہنچے گا۔ کسی کو بھی پتہ نہیں چلے گا کہ وہ بھکشا مانگ کر لایا ہے یا نہیں۔ وہ کرمی ہے یا نہیں!

اُس سے کچھ دُوری پر مزدوروں اور کاریگروں کی ایک ٹولی بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ کئی لفظ اس کے لیے بالکل نئے تھے، جیسے لیبر انسپکٹر، بونس، کم از کم اُجرت وغیرہ۔ کئی لڑکوں نے اس سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہاں ہوں کر کے اُسے ٹال گیا۔ کمتری کے احساس میں جکڑا ہوا بھولے آخر کرتا بھی کیا۔ وہ اُن کی نئی قسم کی بولی سے بھی واقف نہیں تھا۔ اس کے ہم عمر مزدوروں نے اُسے بات چیت کرنے پر نارضامند پایا تو اُس سے دُور ہٹ گئے۔ "نیا کبوتر ہے۔" ایک لڑکے نے کہا۔ "کل تک پنکھ کترے گئے تو راستے پر آجائے گا۔"

چھٹی ختم ہوئی۔ وہ پھر جا کر کام میں جُٹ گیا۔ گرمی بڑھ گئی تھی، لیکن کیا ہوا۔ یہ کام دھوپ میں مارے مارے پھرتے رہنے سے تو بہت اچھا تھا اور پھر اس میں عزت ہی عزت تھی، نہ کسی کا احسان تھا، نہ کسی سے جھڑکی سہنے کی گنجائش۔ کام کیا اور پیسہ لیا۔

کام ہوتا رہا۔ اب اسے تھکاوٹ کا احساس بھی نہیں رہا تھا۔ چار بج گئے۔ پھر پانچ بج گئے، وقت گزرتا رہا۔ چھٹی ہونے کا وقت نزدیک آتا گیا۔۔۔۔۔

وہ صاف شدہ پُرزوں کو بالٹی میں ڈالے مشین کے قریب رکھ رہا تھا کہ گھنٹی کی جانی پہچانی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ وہ چونک اُٹھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ سولہ سترہ برس کا ایک صحت مند لڑکا ہاتھ میں گھنٹی لیے بجاتا ہوا دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی ساتھ اور ورکروں کی نگاہیں بھی اُٹھیں۔

اُس نے دیکھا۔ کام کرنے والوں کے چہروں پر کوئی خاص تبدیلی پیدا نہ ہوئی صرف ایک لڑکے نے ناک سکوڑ کر زمین پر تھوکا۔ باقی لڑکوں نے مُسکرا کر مُنہ پھیر لیا۔ جیسے اُن کے لیے ایک ہٹے کٹے لڑکے کا بھیک مانگنا کوئی خاص بات نہیں تھی۔

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔ پھر چیخ کر بولا "شرم کرو۔ ہٹے کٹے ہو، کام کرو، اور پیسہ کماؤ۔ بھیک مانگتے لاج نہیں آتی تمھیں؟"

سب چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ نیا کم عمر مزدور جس نے تمام دن کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی، اب غصّے سے کانپ رہا تھا۔

○○

مادام تالیئر اور رتن کور

کس کر پکڑی ہوئی کھڑکی کی سلاخوں سے ماتھا ٹکراتے ہوئے رتن کور نے ایک زور کی ہچکی لی اور پھر جیسے اس کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا۔ وہ اونچے اونچے بین کر کے رونے لگی۔ اس نے دروازہ زور سے بند کیا اور پلنگ پر اوندھے منہ گر گئی۔ دروازہ بند کرنے کی آواز سے دوسری چارپائی پر سویا ہوا ننھا بندو چونک اٹھا۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور جب ایک دو بار 'ماں ماں' پکارنے پر بھی اُسے کوئی جواب نہ ملا اور اُس نے ماں کو روتے دیکھا تو وہ خود بھی بلک بلک کر رونے لگا۔

"ہائے وے شیرا! وے میرے پُتّیا شیرا!" "ہائے رے شیر! اے میرے پُتّے شیر!" اس نے گھٹتی ہوئی بیچ کی سی آواز میں بین کیا۔ شدّتِ جذبات سے مغلوب ہو کر سینے پر زور سے دو ہتھڑ مارا۔ جب اس پر بھی غبار نہ نکلا اور جی ہلکا نہ ہوا تو اوندھی ہو کر گھٹنوں میں مُنہ دیے بلکنے لگی۔

ننھا بندو چارپائی سے اتر کر جب اُس کے پاس آیا تو اس نے اسے کس کر سینے سے بھینچ لیا۔ "میرے بیٹے! میرے بہادر سپاہی بیٹے! میرے پُتّے کی سچّی نشانی!" وہ کہتی گئی اور اسے چومتی گئی۔

گھر بالکل اکیلا تھا۔ صبح سے شام تک تو آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا تھا، لیکن شام گہری ہوتے ہی پڑوس کی بوڑھی مائی نانکی نے بندو کو دودھ کا کٹورا پلا کر اور اس کے اپنے کھانے کے لیے دو روٹی اور سالن کی کٹوری چوکے پر رکھ کر اسے پیار سے سمجھایا تھا۔ "لے اب رتن کورے اندر سے

کنڈی لگا لے۔ پرلوک گئے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ سچا سنگھ شہیدی پا گیا تو گورو کی مرضی میں دخل کیسے ہے؟ وہ بھی تو ہیں جو گاؤں ہی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بیماری یا فوج داری میں مرجاتے ہیں۔ تیرا سنگھ تو شہید ہے شہید!"

مائی نانکی کے جاتے ہی اس نے اندر سے کنڈی لگا لی تھی۔ دن بھر آنے والے اور صحن میں بیٹھ کر پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کی باتیں کرنے والے سابق فوجی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ عورتیں جو دن بھر اس کے گرد بیٹھی بین کرتی رہی تھیں اب آنکھیں پونچھ کر اور اسے تسلی دے کر اپنے گھروں میں ہنسی خوشی بیٹھنے کے لیے واپس چلی گئی تھیں۔ کوئی نہیں تھا سارے گھر میں..... لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے گھر کے چپے چپے میں سچا سنگھ کی روح رچی بسی ہو۔ جیسے ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ باہر سے اس کے کیسوں کی خوشبو گھر میں داخل ہو کر اندھیرے میں بھٹکتی پھر رہی ہو اور پکار رہی ہو۔ رتن کورے تم کہاں ہو؟ دیا بھی تو نہیں جلایا تم نے.... میں مورچہ جیت کر گھر چھٹی پر آیا ہوں اور تم نہ معلوم کہاں چھپی بیٹھی ہو!"

وہ زور سے سسکی اور پھر اس نے بندوق کو سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ جیسے اس نے خوشبو سے کہا۔ "میں یہاں بیٹھی ہوں۔ جمعدار سچا سنگھ کی بیوہ رتن کور۔ جمعدار سچا سنگھ جو نیفا کے محاذ پر شہادت پا گئے۔ اس دنیا میں اب میرا کوئی نہیں ہے، سوا اس بچے کے جس کی عمر تین برس ہے۔ بہن بھائی، ساس سسر، دیور، جیٹھ کوئی بھی نہیں ہے۔ میں رتن کور ہوں۔ جمعدار سچا سنگھ کی بیوہ!"

اور پھر یہی خوش بو پھیل کر اس سے لپٹ گئی اور وقت اور فاصلے کی قید سے آزاد اسی خوشبو نے اسے چودہ برس پہلے گاؤں کے پنگھٹ پر لا پھینکا۔ وہ کھلکھلا رہی تھی۔ ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھر رہی تھی اور اس کی سہیلیاں، گاؤں کی الھڑ مٹیاریں اس کے گرد گھوم رہی تھیں۔

"بلّے او بلّے.... حوالدار سچا سنگھ کی منگیتر" اس کی سہیلی بلونت کور نے کہا تھا۔ "بات کرے بھی تو کیسے؟ پاؤں تو ٹکتے نہیں زمین پر میری لاڈو کے۔ جرمنی اور فرانس کی میم ہے میم!"

"بس ہٹ، میں تو جٹی ہوں پنجاب کی۔ مقابلہ کرے تو کوئی میم مجھ سے!"

"پرلاؤڈو...... وہ جو پاؤڈر اور سُرخی فرانس سے لایا ہے نا! اس نے تجھے میم نہ بنا دیا تو کہنا، بس شادی ہونے کی کسر ہے۔ پھر دیکھنا۔!"

"رتن کورے!" منّچا سنگھ نے شادی کی پہلی رات کو کہا تھا۔ "تو تو بولتی ہی نہیں.... دیکھ تو.... اور اس نے ڈبہ کھول کر اسے دکھایا تھا۔" یہ سات الگ الگ شیڈوں والی لپ اسٹک ہے۔ ہونٹوں پر لگانے کی سُرخی.... اور یہ پاؤڈر دیکھ ..... ہاں، ذرا سونگھ تو...... سونگھ، دیکھ اس کی خوشبو!" اور ڈھکن کھلتے ہی جو اسے زور کی چھینک آئی تھی، تو سارا پاؤڈر پلنگ پر بکھر گیا تھا، اور وہ دونوں زور زور سے ہنسنے لگے تھے۔ پھر اس نے اُسے وہ سب چیزیں دکھائی تھیں جو وہ فرانس سے اپنے ڈیڑھ برس کے قیام میں خرید کر لایا تھا، اور جسے اُس نے شادی کی اس رات کے لیے ساڑھے تین برس تک سنبھال کر رکھا تھا۔

"رتن کورے! یہ سب تیرے لیے ہے۔ میری چھٹی تو بس ایک ماہ کی ہے۔ واپس یونٹ میں جاؤں گا۔ ترقی ملنے والی ہے۔ پھر اگلے برس ملاپ ہو گا!"

"فرانس کہاں ہے، میرے سردار جی؟" اس نے پوچھا تھا۔

"فرانس بہت دُور ہے رتن کورے۔ بس سات سمندر پار سمجھ۔ بڑا سُندر دیش ہے، لیکن جرمنوں نے وہ تباہی مچائی کہ گورو کی پناہ! ایک سے ایک بڑھ کر خوب صورت مرد، عورتیں اور بچے۔ گھر اور شہر.... میں تو بس اٹھارہ برس کی عمر میں بھرتی ہوا اور بیس برس کی عمر میں وہاں بھیج دیا گیا۔ ان دنوں جرمنوں کا قبضہ تھا۔ جب پیرس آزاد کرایا گیا تو میں ہندوستانی بٹالین کے ساتھ تھا۔ عورتیں ہماری پگڑیاں اور لمبے لمبے کیس دیکھ کر حیران ہوتی تھیں اور آگے آ آ کر ہاتھ ملاتی تھیں..... بس کچھ نہ پوچھ.... کئی تو ہاتھ چُوم لیتی تھیں۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے چوڑی ہو گئی تھیں۔ اسے یقین نہ آیا تھا۔ "کھاؤ تو گورو کی سوگند۔!"

"گورو کی سوگند۔! ہم ان کے محسن جو تھے ـــ انھیں جرمنوں کے قبضے سے رہائی دلوانے والے اور سکھ رجمنٹ تو خاص کر بے جگری سے لڑی تھی۔ سب اخباروں نے فوٹو چھاپے تھے ہمارے۔ لو میں تمھیں کچھ فوٹو دکھاؤں وہاں کے لوگوں کے۔!"

وہ اُٹھ کر ایک چھوٹا سا بکس لے آیا تھا۔ وہ کہنی پر ٹھوڈی ٹکائے دیکھتی رہی تھی اور وہ لیمپ کی لَو اونچی کر کے اسے دکھاتا رہا تھا، یہ نوٹرے ڈم ہے، یہ رہان کا گرجا گھر ہے۔ یہ میرے دوست ہیں، لاپورتے، بے دال اور سیوان۔ یہ تصویر اس وقت کی ہے جب ہم ٹینکوں پر داخل ہو رہے تھے۔ اور شہر کے بچے کھچے لوگ گھروں کی کھڑکیوں سے رومال ہلا ہلا کر ہمارا استقبال کر رہے تھے اور یہ تصویر..... یہ تصویر .....''

تصویر ایک نوجوان عورت کی تھی۔ صبح کی ہلکی خنکی کی طرح شاداب، شگفتہ اور دل فریب۔ یہ تصویر..... یہ تصویر، رتن کورے.....

اس نے بندو کو سینے سے بھینچتے ہوئے مُنجا سنگھ کی خوش بوسے کہا ''ہاں مجھے یاد ہے۔ وہ تصویر مادام تالئیر کی تھی، جس کا خاوند جرمنوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا، اور جو تمھیں ایک رات سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ملی تھی۔''

''ہاں، وہ مجھے شام کے گہرے دُھندلکے میں گرتی ہوئی برف کے گالوں میں لپٹی لپٹائی ایک لیمپ پوسٹ کی روشنی میں ملی تھی۔ اس کے کندھوں پر فر کا ایک پُرانا کوٹ تھا، اور سر پر اُونی ٹوپی۔ ہاتھوں پر دستانے تھے، جو پھٹ چکے تھے، اور وہ سردی میں کپکپا رہی تھی..... لیکن اس کا حسن اس سردی میں تمتما رہا تھا۔ تلاش بھری حسّاس نظروں سے اس نے میرے فوجی کوٹ کی طرف دیکھا پھر اس کی آنکھیں میری پگڑی کے اس زاویے پر مرکوز ہوگئیں جہاں میرا بیج لگا تھا اور جو واٹر پروف سرپوش کے نیچے سے نمایاں تھا۔ پھر اس نے میرے بھاری فوجی بوٹوں کو دیکھا اور پھر کہا۔ ''ہاں مجھے یاد ہے۔ اس نے کہا تھا، ہینڈسم..... ہینڈسم..... تم میرے ساتھ ایک شام گزارنا چاہو گے؟''

ایک فرانسیسی عورت نہیں، لڑکی..... وہ لڑکی ہی تو تھی رتن کورے بس تمھاری عمر کی معصوم سے چہرے والی لڑکی...... ہاں تو ایک فرانسیسی لڑکی کو شُستہ انگریزی بولتے ہوئے سُن کر مجھے اتنی حیرانی نہ ہوئی جتنی اس بات سے ہوئی کہ انگریز، فرانسیسی اور امریکن فوجیوں کے ہوتے ہوئے اس نے مجھ سے ایسا سوال کیوں کیا؟ ولایتی فوجیوں کی تنخواہیں بھی زیادہ تھیں اور پھر وہ لوگ پینے پلانے، خرچ

کرنے اور ایسی لڑکیوں کے ساتھ بے حد صفائی سے عشق کرنے کے فن میں ماہر بھی تھے۔ سڑک پر مجھ سے کچھ دوری پر اور لوگ بھی چل رہے تھے اور ان میں ولایتی فوجی بھی تھے..... کچھ تو شاید اس جیسی لڑکیوں کی تلاش میں ہی تھے۔ میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا، لیکن اس نے میرا منشا بھانپ کر کہا۔ مجھے پیسے نہیں چاہئیں مونِ یہ..... بس کچھ دودھ اور گوشت کے ڈبے اور ڈبل روٹی.... چاکلیٹ یا کافی کا ڈبہ ہو سکے، تو میں اور بھی ممنون ہوں گی۔"

میں نے اپنے گریٹ کوٹ کی جیبوں میں ٹھنسے ہوئے ہاتھوں سے اس تمام سامان کو محسوس کیا۔ یہ کچن کے ٹھیلر راکھارام کی مہربانی سے مجھے ملا تھا اور میں اسے اپنے پاس ہمیشہ اس لیے رکھتا تھا کہ نہ معلوم کب کسی دوست کو ضرورت پڑ جائے۔ مجھے رضامند دیکھ کر اس نے اپنے بازو سے میرے بازو کا سہارا لیا اور ہم ٹہلتے ہوئے مکانوں کے ایک ایسے بلاک کی طرف چلے گئے، جو بمباری سے بالکل گر چکا تھا۔ مجھے علم تھا کہ مکانوں کے کچھ حصے جو سالم تھے ان میں لوگ باقاعدگی سے رہ رہے تھے۔ راستے میں ہم نے بیکری سے ڈبل روٹی خریدی اور پھر آگے بڑھتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ انگریز اور امریکن سپاہی بہت اودھم مچاتے ہیں اور بعض اوقات تو پڑوس کے کمروں میں رہنے والے لوگ اعتراض کرتے ہیں..... اور اس طرح اسے بہت ذہنی کوفت ہوتی ہے۔

چھوٹا سا ایک کمرہ تھا جو دوسری منزل پر تھا۔ مکان کی اوپر والی تین منزلیں بمباری سے مسمار ہو چکی تھیں۔ کمرے کے اندر ایک اور کمرہ تھا، جو اس وقت بند تھا۔ دونوں کمروں میں روشنی ہو رہی تھی لیکن اندر کوئی نہیں تھا، لفٹ نہیں تھا۔ اس لیے ہم ایک تاریک زینے سے چڑھ کر اوپر پہنچے۔ دروازہ چابی سے کھولتے ہی اس نے اندر کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اس کا دروازہ بند پاکر اسے تسکین سی ہوئی۔ پھر جب میں نے گریٹ کوٹ اتار دیا اور جیبوں سے رم کی آدھی بوتل دودھ، پاوڈر کے دو ڈبے اور گوشت کے دو ڈبے دیے تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

میں ٹوٹے ہوئے بازو والی ایک کرسی پر بیٹھا تھا اور وہ فرش پر ایک چھوٹا سا اسٹول بچھائے بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکا، پھر اس سے کہا۔" دو گلاس لاؤ۔"

اس نے ایلومونیم کے دو پیالے میرے سامنے رکھے، پھر اٹھ کر سٹو جلایا، اور فرائی پین رکھتے ہوئے ٹن اوپنر سے گوشت کا ڈبہ کھول لیا۔ پھر اسے فرائی پین میں ڈالتی ہوئی وہ میرے سامنے آ بیٹھی

ہم دونوں نے ایک ایک پیگ پیا اور جب رم کا ہلکا ہلکا سرور ہم دونوں کی آنکھوں میں لہرانے لگا تو یکایک اس نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا تم شادی شدہ ہو؟" میرا جواب نفی میں سُن کر اسے افسوس سا ہوا۔ "لیکن کوئی لڑکی تو تمھارے انتظار میں ضرور ہو گی؟" اس نے پھر پوچھا۔ جب میں نے پھر انکار میں سر ہلایا تو اس نے کہا۔ "تم کیا جانو ہندوستانی سپاہی، اس دل کی کیا حالت ہوتی ہے، جسے چیر کر اس میں نہ بجھنے والا ایک انگارہ رکھ دیا جائے۔ ..." اور جب پھر بھی میں کچھ نہ سمجھا تو اس نے مسکرا کر کہا۔ "تم اور پیو، اجنبی سپاہی۔ تھوڑی سی اور پیو!"

اس کا چہرہ میرے قریب آگیا۔ تبھی اندر کے کمرے میں کچھ کھٹکا ہوا۔ وہ ٹھٹھکی اور ذرا دور کھسک گئی۔ جب پھر کچھ کھٹکا ہوا اور اسٹول گھسٹنے کی آواز آئی تو وہ بجلی کی طرح تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے دروازہ کھول کر اندر والے کمرے میں چلی گئی۔ جاتے ہی اس نے اندرونی کمرے کی بتی کو بجھا دیا۔ پھر اس نے دھیمے لہجے میں کسی سے کچھ بات کی۔ پھر مجھے ایک ہلکے سے چانٹے کی آواز آئی.... اور میں جو شک و شبے کی دنیا میں گھرا ہوا، پیٹی میں ریوالور باندھے اس پر اپنا داہنا ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ میں جو سات سمندر دُور سے آیا ہوا ایک غلام ملک کا سپاہی تھا۔ میں جو ابھی عمر کے اس حصّے تک نہ پہنچ پایا تھا، جہاں ماں باپ بچّوں سے پیار کرتے ہیں، ان کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ انھیں سزا دیتے ہیں۔ میں جو سچا سنگھ تھا، رتن کورے، پنجاب کا الھڑ البیلا..... میں اُٹھ کھڑا ہوا اور چلتا ہوا ساتھ کے کمرے کے دروازے تک گیا۔ ہاتھ بڑھا کر بٹن دباتے ہوئے میں نے روشنی کر دی...."

رتن کور نے سوتے ہوئے بندو کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔ "مجھے ساری بات یاد ہے، میرے دار جی..... آپ نے چودہ برس پہلے شادی کی پہلی رات کو ساری بات مجھے بتائی تھی۔ آپ نے جب روشنی کر دی تو آپ نے دیکھا چھوٹے سے ایک اسٹول پر ایک تین برس کا مُرجھایا ہوا بچّہ بیٹھا اپنے ٹھنکنے کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتا ہوا ماں سے لپٹ رہا تھا اور فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی ماں اسے یہ سمجھانے کا جتن کر رہی تھی کہ جب ماما کے دوست آئیں تو شور نہیں مچایا جاتا ...."

"ہاں' رتن کورے! مادام تالیئر جو ایک فرانسیسی فوجی افسر کی بیوہ تھی اور جو امن کے زمانے میں اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اب پچھلے دو برس سے اپنا اور اپنے بچّے کا پیٹ اس طرح پال رہی تھی۔ اس نے اپنے بچّے کے مستقبل کے لیے اپنی عزیز ترین شے بیچ کر گزارہ کیا تھا۔ وہی مادام تالیئر ایک ماں کے رُوپ میں میرے سامنے تھی۔ میں بچّے کو گود میں اُٹھائے ہوئے باہر کے کمرے میں لے آیا۔ وہ بیحد شرمیلا تھا۔ وہ چہرہ جو کبھی گول' نرم اور سُرخ و سپید رہا ہوگا' اب مُرجھا گیا تھا۔ آنکھیں شوخی و شرارت سے عاری تھیں۔ میں نے اُس کمھلائے ہوئے پھُول کو پیار کیا۔ پھر اس کی ماں نے کمرے کے نہ معلوم کس گوشے سے ایک تصویر نکالی۔ ایک شکیل فرانسیسی نوجوان کی تصویر' جو فوجی وردی میں ملبوس تھا۔ اس نے تصویر کو آنکھوں سے لگایا' چُوما' پھر بچّے کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ بچّے کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے کہا۔" آآآ آپاپا..... پاپا۔"

اس کی ماں نے اُسے دُودھ بنا کر دیا۔ پھر دھات کی ایک پُرانی پلیٹ میں گوشت کے تِکّے رکھے' پھر اپنے اور میرے لیے کافی بنائی جو بہت زیادہ خوش مزہ نہ تھی۔ کیوں کہ پاؤڈر نہ ہونے کے برابر تھا' اور کھانڈ کی ٹکیاں تو ناپید تھیں۔

بچّہ میری گود میں بہت آرام محسوس کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ سو گیا تو اس نے اسے اُٹھا کر اندر کے کمرے میں بستر پر لٹا دیا۔ پھر میرے پاس آ بیٹھی۔ میری آنکھوں میں جھانکا' میرے گلے میں باہیں ڈالیں' مجھ سے کہا۔" میں بہت ممنون ہوں اجنبی سپاہی......"

تبھی رتن کور اس کی باہوں میں جھُولتی ہوئی اپنا چہرہ اُٹھا کر بولی تھی —" پردار جی' فوجی جنگ میں کام آجائیں تو اُن کی بیواؤں کو پنشن ملتی ہے نا؟ پھر تالیئر کو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

" بھولی ہے تو بھی!" اس نے کہا تھا۔" جنگ میں کون کسی کا ہوتا ہے؟ سرکاریں پلٹ جاتی ہیں۔ بچے کھچے ملبے اور بچے کھچے لوگوں میں کوئی فرق نہیں رہتا' کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ سبھی اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ پھر جب امن ہو جاتا ہے' دھیرے دھیرے حالات معمول پر آجاتے ہیں' سرکار دوبارہ طاقت سنبھالتی ہے' تو فہرستیں بنتی ہیں' گواہیاں ہوتی ہیں اور تب جا کر فوجیوں کی بیواؤں کو کچھ پنشن ملتی ہے....."

اس نے سچّا سنگھ کی خوشبو کو یاد کر کے ہونٹوں سے پیتے ہوئے کہا۔ "آپ تو کہتے تھے، مادام تالیٹرا ایک بہادر عورت تھی۔ زندہ رہنے اور زندہ رکھنے کے فن میں ماہر تھی، لیکن آپ نے یہ بھی تو مانا کہ آپ پہلے فوجی تھے جس نے اپنے کھانے پینے کے سامان کی قیمت اس سے وصول نہ کی۔ جتنی مدت وہاں رہے اس کی امداد کرتے رہے، لیکن آخر کب سے وہ یہ قیمت ادا کرتی آرہی تھی۔ اور وا ہگورو جانے کب تک کرتی رہی ہوگی۔ میں تو دارجی، میں تو..... میں تو مر جاؤں گی دارجی! میرا بندو، میرا بندو بھی تو تین برس کا ہے نا؟"

رات بے حد کالی تھی، سنسان، ویران، گہری سیاہ رات اور تاریکی میں اس کے آنسو ٹپ ٹپ بندو کے ماتھے پر گر رہے تھے، جو ان کی تمازت کی تاب نہ لاکر جاگ اٹھا تھا اور اب پھر کہہ رہا تھا "ماں ماں!"

"تم جہاں بھی جاؤ گی" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "یہی تاریکی، یہی ویرانی، یہی خاموشی اور یہی اُداسی ملے گی۔"

رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو بھی گئی۔ کہرا کم ہوا اور بخار سی تھکان اور بیمار نیند سا خمار ذہن سے چھٹا۔ نیند اور ہلکی ہوئی اور جب وہ جاگی تو سویرا ہو رہا تھا اور کوئی زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس نے جھک کر بچے کی پیشانی پر جگمگاتے ہوئے زندگی کے پاکیزہ وقار کو چوما۔ دروازہ کھولا۔ باہر سرپنچ نتھا سنگھ اور اس کی بیوی ہرنام کور کھڑے تھے۔ اس نے پلّو سر پر ڈال لیا۔ جب وہ اندر آگئے اور ماتم پرسی کو آنے والوں کے لیے بچھائی ہوئی دری پر بیٹھ گئے تو وہ بھی سر نیوڑھائے ایک طرف بیٹھ کر انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔ وہ آنکھیں جو خاموشی سے ساری رات زمین و آسمان کے درمیانی خلا میں اپنا کھویا ہوا ماضی تلاش کرتی رہی تھیں۔ ایک بار پھر پانی برسانے لگیں۔

سرپنچ نتھا سنگھ نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "بیٹی، رو نہ! سچّا سنگھ کی شہادت نے ہمارے گاؤں کا نام اونچا کیا ہے۔ رات ضلع کے صدر مقام سے جو پیادہ آیا ہے، اس نے بتایا ہے کہ آج شام کو یہاں ایک شہیدی جلسہ ہوگا۔ ہم تم سے سچّا سنگھ کی کوئی تصویر مانگنے آئے ہیں۔ کوئی بھی نیا پرانا فوٹو ہو تو کام چل جائے گا۔ شام تک اسکول کا ڈرائنگ ماسٹر اس سے ایک بڑی سی تصویر نقل کرے گا۔"

ہرنام کور نے کہا۔ "بیٹی ایک سہارا ٹوٹتا ہے، تو دس اور بنتے ہیں..... اٹھ کپڑے بدل

کچھ کھا پی لے، بچے کو نہلا دُھلا کر نئے کپڑے پہنا۔ اس کے کیس سنوار۔ شام کو کیا پتہ کون کون بڑبھاگی مہاپُرش ہمارے گاؤں میں آئے اور ہمیں کوئی تصویر دے دے سچا سنگھ کی۔ !"

وہ اُٹھی، اندر گئی، اپنا بکس کھولا اور کپڑوں کی تہوں کے نیچے سے ایک تصویر نکالی اسے دیکھا، پھر آنکھوں سے لگایا، چوما اور باہر نکال لائی۔ سچا سنگھ فوجی وردی میں ملبوس تھا۔ یہ تصویر اس وقت کی تھی جب وہ ابھی حوالدار تھا۔ سینے پر چار مختلف رنگ پہنے، بانہوں پر تین فیتے لگائے وہ جیسے کیمرے کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور ...... ایک لمحے کے لیے اسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنے خاوند کی نظروں سے مادام تالئیر کے بچے کے پاپا کی تصویر دیکھ رہی ہے اور تصویر سچا سنگھ کی نہیں، ایک وجیہہ اور شکیل فرانسیسی نوجوان کی ہے۔ سسکتے ہوئے اس نے تصویر نتھا سنگھ کو پکڑا دی۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "بیٹی، اب تیار رہنا جلسے کے لیے ..... اور دیکھو رونا مت، تو شہید کی بیوہ ہے۔"

وہی تاریکی، وہی ویرانی، وہی خاموشی اور وہی اُداسی۔

لیکن اب تو دن کی روشنی ہے، گہما گہمی ہے، جیسے شادی کا ہنگامہ ہو، شور و غل ہے۔ لوگ آجا رہے ہیں، گاؤں کی لڑکیاں ہنستے ہوئے بندو کو کپڑے پہنا رہی ہیں، سر کے بالوں کا جوڑا بنا کر پگڑی باندھ رہی ہیں۔ تین برس کا ننھا سا بچہ جس کے بال اتنے چھوٹے ہیں کہ پگڑی کی تاب نہیں لاسکتے، مچل رہا ہے۔ ٹھنکتا بھی ہے اور ہنستا بھی ہے۔ اسکول کے لڑکے کھجور کے بڑے بڑے پتے اکھاڑ لائے ہیں اور گلی میں استقبالیہ دروازہ بنا رہے ہیں۔ کچھ لڑکوں نے کپڑے پر بڑے بڑے حروف میں لکھا ہے "شہید سچا سنگھ زندہ باد!" ایک طرف رنگ برنگے کاغذوں کی جھنڈیاں بنائی جا رہی ہیں۔ دوسری طرف باتوں کی بھن بھن ہے، عورتوں کی آوازیں ہیں۔ گوردوارے کے باہر کھلے لنگر کے لیے دیگچے چڑھے ہیں۔ اندر پاٹھ ہو رہا ہے۔ ایک طرف چارپائیوں پر بڑے بوڑھے بیٹھے ہیں۔ جیپ کار پر کوئی آدمی پنڈال بنانے کا سامان لے آیا ہے اور اب ہاتھ بٹانے کے لیے مردوں کو پکار رہا ہے۔ شہر کا جو آدمی لاؤڈ اسپیکر سیٹ لایا ہے کہہ رہا ہے۔ "ہیلو ہیلو، ٹیسٹنگ ٹیسٹنگ!"

"یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کیوں ہے؟"

کاریں آرہی ہیں، دو بسوں میں آدمی ہی آدمی بھرے ہیں۔ کاروں سے اُترنے والوں کے گلوں میں ہار ڈالے جارہے ہیں۔ ایک اُدھیڑ عمر لمبا کھادی پوش بزرگ آدمی ہے، جس کی داڑھی لہرا رہی ہے۔ عینک پوش چہرے پر اِتنا جلال ہے کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی۔ اس کے ساتھ ہی کار سے ایک نوجوان خاتون اُتری ہے، تیکھے کشمیری نقوش، خوب صورت چہرہ اور نہایت ہی خوب صورت بال۔

یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کیوں ہے؟

لوگ جلوس کی شکل میں گلی سے گزر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں جمعدار سچا سنگھ کی ایک بڑی سی تصویر ہے۔ برش، پنسل اور چاک سے بنی ہوئی یہ تصویر سچا سنگھ کے چہرے کی پورے طور پر نمائندہ تو نہیں لیکن پھر بھی پہچانی جاسکتی ہے۔ لوگ نعرے لگا رہے ہیں۔ زور زور سے نعرے لگا رہے ہیں۔ "زندہ باد! زندہ باد!" جلوس پنڈال تک پہنچ کر ختم ہوگیا۔ لوگ بیٹھ گئے ہیں۔ کھادی پوش لمبا بزرگ جس کی ڈاڑھی ہوا میں لہرا رہی ہے اُٹھ کر تقریر کر رہا ہے۔ وہ بھی عورتوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی جلسہ گاہ تک پہنچ گئی ہے، انھیں آتے دیکھ کر لوگ اُٹھ کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ تقریر کچھ دیر کے لیے بند ہوگئی ہے۔ لوگ نعرے لگا رہے ہیں اسے مخاطب کر کے نعرے لگا رہے ہیں۔ وہ سب کے ساتھ ہی اسٹیج کے قریب دری پر بیٹھ گئی ہے۔ تیکھے نقوش والی خوب صورت خاتون جو سفید کھادی کی ساری میں ملبوس ہے، اسٹیج پر رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھی ہے اور اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ کوئی اس کے کان میں کہتا ہے۔ "یہ ہمارے پردھان منتری کی بیٹی ہے۔"

یہ بندو کو کس نے اُٹھا لیا ہے؟ کون اسے اُٹھائے ہوئے اسٹیج تک لے آیا؟ یہ تو سرپنچ نہال سنگھ ہے۔ بندو کی رنگین پگڑی کس کر بندھی ہوئی ہے۔ اس نے بیساکھی کے میلے کے لیے سلوائے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ سرپنچ اسے لے کر اسٹیج تک پہنچا ہے۔ یکایک جلسہ گاہ میں خاموشی ہوگئی ہے۔

تقریر کرنے والا بزرگ آدمی کہہ رہا تھا۔ "اور یہ ہے شہید سچا سنگھ کا لڑکا۔ قومیں جو اپنے شہیدوں کو یاد نہیں رکھ سکتیں اور اپنے شہیدوں کے نام لیواؤں کو در بہ در بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیتی

ہیں بہت عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتیں۔ ہمارا حقیر نذرانہ اس کے لیے ہے۔ اس کی تعلیم کی بیمہ پالیسی جس کا چندہ سرکار ادا کرے گی۔ یہ ہے فوری اخراجات کے لیے نقد روپے کی تھیلی، جو شہید کی بیوہ کے لیے ہے، اور یہ کپڑے سینے کی مشین اور یہ کچھ کپڑے اور دوسرے تحفے..... اور ہم نے گاؤں کے مڈل اسکول کو ہائی اسکول بنا کر اس کا نام شہید سُچّا سنگھ کے نام پر رکھ دیا ہے.....''

یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کیوں ہے؟

عورتیں اسے اُٹھا رہی ہیں۔ تیکھے کشمیری نقوش اور خوب صورت چہرے والی خاتون کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک تھیلی ہے۔ اس کے چہرے پر افسوس کی لکیریں اُبھر آئی ہیں۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ عورتیں اسے لیے ہوئے اسٹیج تک آ گئی ہیں۔ پھر سہارا دے کر اسے اوپر چڑھا دیا گیا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ جُڑے ہیں۔ ہر طرف خاموشی ہے۔ اسٹیج پر کون کون بیٹھا ہے۔ اسے کچھ پتہ نہیں۔ بندو نے لپک کر اس کا دامن پکڑ لیا ہے۔

لیکن وہ کیا کہہ رہی ہے؟ کون ہے، جو اس کے اندر سے بول رہا ہے؟ کس نے اس کی زبان پر سرسوتی بٹھا دی ہے؟ تیکھے کشمیری نقوش والی خوب صورت خاتون سے کاغذوں کا ایک لفافہ اور نوٹوں سے بھری تھیلی لیے ہوئے وہ کہہ رہی ہے۔ ''میں رتن کور ہوں جی، شہید سُچّا سنگھ کی بیوہ..... اور میرا بچّہ بندو ہے جی۔ یہ سب لوگ اس کے چاچے، تائے، بھائی بند ہیں جی۔ آپ میری چنتا نہ کریں جی۔ یہ بڑا ہو کر بہادر سپاہی بنے گا جی..... اور میں رتن کور ہوں جی..... ! دام تالیُر نہیں ہوں جی!''

اور وہ سسک رہی ہے، وہ رو رہی ہے، وہ مُسکرا رہی ہے۔

○○

پنجاب اور بنگال کے ہاتھ

روتے ہوئے کسی بھی شخص کی طرف دیکھ کر مجھے کوفت ہوتی ہے۔ آنسوؤں سے شاید مجھے خدا واسطے کا بَیر ہے یا میری طبیعت میں رونے دھونے کا عنصر بالکل ہی موجود نہیں۔ یا یہ کہ رونا میرے نزدیک کمزوری اور بے چارگی کی نشانی ہے۔ کچھ بھی ہو رونا مجھے اکھرتا ہے۔ لیکن ایک اُدھیڑ عمر شخص کے جھرّیوں بھرے گالوں پر لڑھکتے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھے کوفت کی بجائے خود رونا آ سکتا ہے۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

اس کیمپ ہسپتال کے ایک بیڈ کے قریب بیٹھے ہوئے ہم دو اخبار نویسوں سے جب زخمی جوان کا تعارف کرایا گیا تو ہم دونوں بڑی گرم جوشی سے اس کا اکلوتا ہاتھ دبانے کے لیے آگے بڑھے، جسے وہ سُرخ کمبل کے نیچے سے کانپتے ہوئے نکال رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھری ہوئی سیاہ سفید داڑھی اور جوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے بالوں سے یہ اندازہ تو ہم نے پہلے ہی لگا لیا تھا کہ وہ پہلی پٹیالہ رجمنٹ کا بہادر سکھ جوان ہے لیکن اس بات کا ہمیں پتہ تک نہ تھا کہ وہ اس گروہ میں شامل تھا جو چینی حملہ ہوتے ہی محاذ کے پہلے مورچے پر جوشوں سے آگے بھیجا گیا تھا اور جس کی بہادری کے کارناموں کی دھاک ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے پہلے ہی لوگوں کے دلوں پر بیٹھ چکی تھی۔

میں یوپی کا رہنے والا ہوں اس لیے پنجابی میں اچھی خاصی شد بد رکھتا ہوں۔ میرا ساتھی اخبار نویس بنگالی ہے، وہ ہندوستانی تو خوب سمجھ لیتا ہے، لیکن پنجابی اور خالص محاورہ دار پنجابی اس کے گلے سے اُترنے والی دوا نہیں۔ اس لیے پنجابی جوانوں سے ملتے وقت وہ مجھے ڈھال کے طور پر استعمال کرتا ہے اور اپنے سوالوں کی بندوقیں بھی میرے شانے پر رکھ کر داغتا ہے۔ یعنی نہ صرف اس کے سوال بلکہ جوانوں سے ملے ہوئے جواب بھی مجھے اس کی خاطر ترجمہ کرنے پڑتے ہیں۔

اس لیے جب زخمی جوان نے اپنا دایاں ہاتھ کانپتے ہوئے کمبل سے نکال کر ہماری طرف بڑھایا اور صاف اردو میں کہا۔" میں آپ کو ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کرتا، پر میرا دوسرا ہاتھ تو لداخ کی مٹی میں دبا ہے" تو مجھے ترجمہ کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ موزمدار نے مجھ سے پہلے ہی آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو تھاما اور ہلکا سا دباتے ہوئے ہندی میں کہا۔" ہمارے ہاتھ اپنے دیش کی مٹی میں دبیں، اس سے بڑھ کر سوبھاگیہ اور کیا ہو سکتا ہے۔" اور میں نے ان دونوں کے دو ہاتھوں کو اپنے دو ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔" پنجاب یوپی اور بنگال کے ہاتھ جب مل جاتے ہیں تو کسی ایک کے کٹنے پر باقی اس کی جگہ لے لیتے ہیں۔!"

تب نہ معلوم کیا ہوا۔ بالوں اور جھرّیوں کے تانے بانے سے اُٹے ہوئے اس مرجھائے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ایک رنگ آیا۔ آنکھیں موٹی بھوؤں کے نیچے سے کچھ پھیلیں۔ ان میں چمک پیدا ہوئی۔ اس فولادی چمک سے پانی پیدا ہوا، جیسے تلوار کو آب دے دی گئی ہو اور پھر موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر بالوں سے اُلجھتے ہوئے لڑھکنے لگے۔

میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔

وہ سنبھلا تو اس نے کہا۔" لیفٹننٹ سرکار نے جب مجھے ان ہی لفظوں سے حوصلہ دیا تو میرے جسم میں تین گولیاں پیوست تھیں اور وہ اپنی مشین گن سنبھالے صندوق کے ایک سرے پر بیٹھا بار بار دوسرے ہاتھ سے میرے زندہ ہاتھ کو مسل رہا تھا۔ تب میرا بایاں ہاتھ جیسے ماس کے ایک تاگے سے لٹک رہا تھا..... اور..... اور مجھے کبھی خیال نہیں آ سکتا تھا کہ ان لفظوں کا کہنے والا تو دیش پر جان وار جائے گا اور میں یہاں ہسپتال میں پڑا اس لیے تڑپوں گا کہ ایک ہاتھ سے میں کبھی ایک گولی تک نہیں داغ سکوں گا....."

اخبار نویسوں کو تو کہانیوں کی تلاش رہتی ہے۔ ہمارے ایڈیٹر ہمارے ڈسپیچ کے جواب میں اور کہانیاں مانگتے ہیں۔ جب بھی کسی جوان کی شجاعت، دلیری اور قربانی کی کوئی داستان شائع ہوتی ہے ہزاروں کی تعداد میں پڑھنے والوں کے خط ملتے ہیں۔ اس جوان کی تصویر اور اس کے قریبی عزیزوں کے پتے بھیجنے کے لیے اخبار کو ایک خاص آدمی لگانا پڑتا ہے۔ اس لیے جوں ہی ہم نے لفٹیننٹ سرکار کا نام سُنا اور زخمی جوان کی بات سے اس امکان کا اندازہ لگایا کہ اس جگہ سے ہم ایک اوّل درجہ کہانی لے کر ہی باہر جائیں گے تو ہمارے دونوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ میں اپنے آنسو بھول گیا اور صرف وہ نوٹ بک اور پنسل یاد رہی جو ہر وقت میرے کوٹ کی دائیں جیب میں رہتی ہے۔

موزمدار نے کہا: "آپ ہمیں لفٹیننٹ سرکار کی بابت بتائیے گا؟"

صوبیدار سوداگر سنگھ نے میری طرف دیکھا۔ مجھے جیب میں ہاتھ ڈالے ہوئے دیکھ کر وہ مُسکرایا۔ پھر بولا: "آپ ڈائری مت نکالیے۔ میرے پاس زیادہ بتانے کو کچھ نہیں ہے۔ ۳۱ اکتوبر کی شام اور رات اور یکم نومبر کے دن کو ہماری چوکی پر جو ہوا اس کی یادگار صرف میں ہوں۔ گولڈسمتھ کی بڑھیا کی طرح دُکھ کے صحرا کا افسردہ مورّخ بس میں ہی ہوں۔ میں آپ کو دھیرے دھیرے ساری بات بتاتا ہوں ـــ"

... اتنے میں نرس آئی۔ دُبلی پتلی سی، سانولی لڑکی جو اسے دیکھ کر مُسکرائی: "کیسا حال ہے صوبیدار؟" اس نے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر تھرمامیٹر اس کے مُنہ میں ٹھونس دیا۔ ہم چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ وہ گھڑی کی سُوئی دیکھتی رہی اور صوبے دار سوداگر سنگھ چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ جب آدھ منٹ کے بعد اس نے تھرمامیٹر نکال کر ٹمپریچر چارٹ پر نوٹ کر لیا اور چلی گئی تو ہم پھر اسٹولوں پر آگے کی طرف جُھک کر بیٹھ گئے۔ صوبے دار چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک لمبی سانس لی۔

"ہم لوگوں کی تو ساری عمر ہی فوج میں گزری ہے۔ لیکن لفٹیننٹ سرکار ابھی گبرو تھا۔ ۲۵-۲۶ برس کا لمبا سانولا نوجوان، جسے محاذ سے دُور فوجی چھاؤنیوں میں تو شاید وردی کے کلف اور ناچ کے قدموں سے ہی دل چسپی رہی تھی۔ ہماری یونٹ میں کہیں اور سے بدل کر نیا نیا ہی آیا تھا۔ اس کا جسم شاید پارے سے بنا تھا، ہر وقت تیار، ہر وقت تیار ..... ۳۱ اکتوبر کی شام کو ہم لوگ چوشول

سے مغرب کی طرف ۲۲ میل دُور ایک چوکی پر تھے۔ حملہ ہو چکا تھا، لیکن ابھی تک ہمیں زیادہ ایکشن دیکھنے کا موقع بالکل نہ ملا تھا۔ ہماری چوکی ایک چھوٹی پہاڑی کی عین چوٹی پر واقع تھی۔ ہم نے دائرے کی شکل میں چاروں طرف بیس گز کی گولائی میں خندق کھود رکھی تھی، جس کے اوپر سبز ترپالیں اور کٹی ہوئی جھاڑیوں اور شاخوں سے بنے ہوئے جال تھے۔ خندق کے بیچ میں جہاں سے پوری گولائی نظر آتی تھی۔ ہماری کینٹین ہمارے فالتو کمبل اور ہمارا گولہ بارود تھا۔ ہماری چوکی ہر لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی تھی کہ تین دن پہلے جن چوکیوں کو لتاڑتے ہوئے اپنا بھاری جانی نقصان سہہ کر بھی چینی آگے بڑھے تھے، ان سے چوشول تک کا راستہ ہماری پہاڑی کے دامن سے ہو کر گزرتا تھا۔ ہمارے لیے حکم یہ تھا "دشمن کا کوئی دستہ پہاڑی کے دامن سے چوشول کی طرف نہ بڑھنے پائے۔" فیلڈ ٹیلیفون سے صبح کے وقت لفٹیننٹ کی طرف سے جو حکم ملا تھا، اس میں غلطی کی گنجائش کم تھی۔ یہ بات پکی تھی کہ ہماری اس پوزیشن کا دشمن کے سپاہیوں کو علم نہیں تھا۔۔۔۔ اگر انھیں پہلے سے علم ہوتا تو شاید ہم انھیں اڑتالیس گھنٹے تک روکے نہ رکھتے۔۔۔" مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی کرن جیسے بھول کر اس کے ہونٹوں پر آ بیٹھی۔

میں نے کہا: "آپ سب کل کتنے آدمی تھے؟"

وہ بولا: "یوں تو وہاں میرے اور لفٹیننٹ سرکار کے پہنچنے سے پہلے صرف ایک حوالدار، دو نائک اور پندرہ جوان تھے، لیکن پھر ہمارے پہنچنے پر ہم کل سترہ ہو گئے۔ دشمن اپنی سپلائی لائینوں سے نہ صرف ٹرکوں اور جیپوں پر سامان اور گولہ بارود لانے میں ہم سے آگے تھا، بلکہ اس کے پاس تبتی مزدوروں کی ایک پوری فوج تھی۔ ان کی سیلابی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ ہی یہ مزدور سڑک تیار کرتے جاتے، اس لیے ان کی سپلائی بہت باقاعدہ تھی۔ اگر ان اڑتالیس گھنٹوں میں وہ ہماری پہاڑی کے پاس سے بلا مقابلہ آگے نکل جاتے تو چوشول کے ہوائی اڈے کو فوری خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔"

اس نے پھر ایک لمبی سانس لی ––– خیر رجمینٹل کمانڈر کے جو احکام اس صبح فیلڈ ٹیلیفون پر ملے ان سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کا کام ہمارے ذمے ہے۔ ہماری یہ پوزیشن اس تالے کی طرح تھی جسے چور کسی خاص کنجی سے ہی کھول سکتا ہے۔ چوشول وہ خزانہ تھا جس کے لیے چور دشمن ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

"لفٹیننٹ سرکار نے احکام سننے کے بعد جیسے ایک لمحہ سوچا۔ میں نے دیکھا ہم سب ستار

کے تاروں کی طرح کھنچے ہوئے اس حکم کا انتظار کر رہے تھے جو ہمارا نوجوان لفٹیننٹ سُن چکا تھا۔ میرے دائیں طرف ایک گز کے فاصلے پر چکر دھاری تھا جو کانگڑہ کا رہنے والا تھا۔ اس سے آگے ضلع لدھیانہ کے پھپھیرے بھائی رام سنگھ اور کرنیل سنگھ تھے۔ بھاگ سنگھ اپنی مشین گن پر دونوں ہاتھ جوڑے شاید ارداس کر رہا تھا۔ اُس سے پرے گولائی میں آدھا میری نظروں سے اوجھل اور آدھا سامنے بالک رام تھا۔ رہتک کا برہمن جو ہمیں ہریانے کے لوک گیت سنا کر خوش کیا کرتا تھا...... ہاں تو لفٹیننٹ سرکار نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر جیسے اسے احساس ہوا کہ ہم لوگوں سے کچھ بھی چھپانا ایک بہت بڑا اخلاقی جرم ہوگا۔ اس نے حکم کو لفظ بہ لفظ کہہ سُنایا:

وسپلائی اور کمک کی گنجائش بہت کم ہے۔ ہیلی کوپٹر سے شاید کچھ گولہ بارود اور کھانا گرایا جائے۔ لیکن ہمیں دشمن کے پیدل یا گاڑی دستوں کو اس راستے سے گزرنے نہیں دینا ہے..... ہم تعداد میں بہت کم ہیں لیکن ہماری پوزیشن مضبوط ہے۔ یہاں سے ایک چڑیا......

''اور میں نے کہا — کا بچہ بھی گزرے' یہ مجال نہیں۔ ہم سب حاضر ہیں صاحب!''

''سرکار نے ممنون نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اڑتالیس گھنٹے..... دو دن۔ اگر دشمن یہاں دو دن رک جائے تو چوشول کا دفاع مضبوط ہو سکتا ہے'۔ تب رام سنگھ اور کرنیل سنگھ نے آپس میں کھسر پھسر کی۔ پھر کرنیل سنگھ نے کہا' ہمارا امونیشن ختم ہو جائے تو؟' مالک رام دور سے بولا۔ 'ہم سنگینیں چڑھا لیں گے!' لیکن نوجوان لفٹیننٹ بولا' نہیں جوان' یوں نہیں۔ ہم چُن چُن کے ماریں گے۔ ایک ایک کو' دو دو کو..... ہمارا ایک گولی بھی خالی نہیں جائے گا۔ ہمیں ویسے نہیں مرنا ہے..... مارتے ہوئے مرنا ہے'۔ تب اس نے فیلڈ ٹیلی فون اٹھایا لیکن اسی وقت پہاڑی کے دامن میں ایک دھماکہ ہوا۔ دور سے آیا ہوا کوئی گولا پھٹا اور اس کے ساتھ ہی گھاس پھوس اور کنکروں سے ہو کر آتی ہوئی ہماری فون کا سلسلہ رجمنٹل کمانڈر سے ٹوٹ گیا' جو ہم سے چار میل نیچے ایک اور چوکی پر گشت کے دوران میں آیا ہوا تھا۔

''تب مجھے لگا کہ اب ہمارا واسطہ صرف اپنے نوجوان افسر سے ہے' جس نے شاید اب تک اصلی لڑائی نہیں دیکھی۔ اسی کے حکم اور اسی کی فوجی ذہانت پر ہماری زندگیوں اور ہمارے دو کے فوجی ٹھکانوں کے بچاؤ کا انحصار ہے۔ لفٹیننٹ نے پھر میری طرف دیکھا — اس کا نائب کمانڈر ہونے اور

پنجابی نلطے سے میں ہی باقی جوانوں سے اس کا رشتہ استوار رکھ سکتا تھا۔ میں نے کہا، "حکم بالکل صاف ہے صاحب!"

"اسی وقت دُور نیچے چھ سو گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ ہم جیسے بجلی کے جھٹکے سے سُن ہو گئے۔ ہونٹوں پر انگلیاں رکھ لی گئیں۔ لفٹیننٹ سرکار نے گلے میں لٹکتی دُوربین کو آنکھوں پر لگایا۔ آدھا منٹ غور سے دیکھا۔ پھر ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے اس نے کہا" حکم آگے بتاتے جاؤ۔ دُشمن پیدل آگے بڑھے گا۔ تعداد لگ بھگ دو سو ہے۔ میرے حکم کے بغیر کوئی گولی نہ چلانے پائے!"

"جیسے سانس روکے ہوئے ہم اپنے اپنے ہتھیاروں پر جم گئے۔ لفٹیننٹ سرکار گھٹنے دبا کر لیٹ گیا۔ اپنی برین گن پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے ایک نظر پھر ہم سب کی طرف دیکھا۔ اب لمبے پودوں اور جھاڑیوں میں سرسراہٹ زیادہ ہو گئی تھی۔ دشمن کے سپاہی گھٹنوں اور پیٹ کے بل اوپر رینگتے آرہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں خیال آیا، اب انتظار کس بات کا ہے، کیوں نہیں دس مشین گنیں اپنا راگ الاپتیں۔ اور اس سرسراہٹ کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیتیں، لیکن پھر مجھے حکم یاد آیا، میرے حکم کے بغیر کوئی گولی نہ چلانے پائے!"

"لفٹیننٹ نے پھر دُوربین اُٹھائی اور پھر فوراً ہی رکھ دی۔ شاید اس لیے کہ لاشعوری طور پر جو کپکپی اس کے ہاتھ میں تھی اسے کوئی دیکھ نہ پائے۔ ہم سب کی نظریں دشمن کی طرف تھیں۔ ہماری موجودگی سے بے خبر اب وہ اور تیزی سے اُٹھتے، بیٹھتے، رینگتے ہوئے اوپر آرہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے دس بارہ سر ایک ساتھ جھاڑیوں اور لمبی گھاس کے اوپر اُٹھ جاتے، پھر چھپ جاتے، پھر نظر آتے، پھر چھپ جاتے۔ اب وہ دو سو گز سے بھی کم دُور تھے۔ کسی کو سامنے نہ پاکر جیسے ان کی ہمت بڑھ گئی تھی۔ دس بارہ تو اپنی بندوقیں اور ہتھیار سنبھالے سیدھے دندناتے بڑھے آرہے تھے۔ اپنی سٹین گن کے گھوڑے پر میری انگلی کانپ رہی تھی۔ کیوں نہیں میں انھیں بھون کر رکھ دیتا۔ میری انگلی مجھ سے پوچھ رہی تھی، لیکن حکم صاف تھا میرے حکم کے بغیر کوئی گولی نہیں چلنے پائے!"

سوداگر سنگھ بستر پر پڑا پڑا چپ ہو گیا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

کمبل سے نکلے ہوئے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اضطراری کیفیت میں تڑپ رہی تھیں۔

وہ پھر بولا "لفٹیننٹ میری امیدوں سے کچھ زیادہ ہی محتاط اور عقل مند تھا۔ میں سمجھ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار چینیوں کی پوری تعداد ہی سامنے آجائے تو پتہ چلے۔ جب دشمن کی پہلی قطاروں کے لوگ ہم سے صرف پچاس گز دور رہ گئے اور ہم نے دیکھا کہ دس بارہ قطاروں کے بعد اب کوئی نئی قطار پچھلی پہاڑی کی اوٹ سے نہیں نکل رہی ہے تو بھنچی ہوئی آواز میں لفٹیننٹ سرکار نے پھر کہا، 'میری پہلی گولی اس بات کا اشارہ ہوگی کہ انھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔'

'بھون کر رکھ دو۔' میں نے فقرہ پورا کیا۔

"حکم ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک خندق کی ساری گولائی میں گھوم گیا۔ میری نظریں دشمن کی اگلی قطار پر جم گئیں۔ ناٹے سے قد کا، بھاری اونی وردی پہنے، تین فیتے لگائے جو چینی ہراول دستے میں تھا۔ اس کی آنکھوں کے بیچ والی جگہ پر میری پہلی گولی لگے گی۔ میں نے سوچا، لیکن لفٹیننٹ سرکار سے حکم کیوں نہیں ملتا، کیوں نہیں۔ ۔ ۔ ۔

"اس کی برین گن کا گھوڑا دبا۔ پہلی بوچھار کے ساتھ ہی اس طرف سے دس اور گھوڑے دبے۔ میں نے دیکھا، ناٹے چینی جے سی او کے چہرے پر ایک لمحے کے لاکھویں حصے کے لیے حیرانی اور بے یقینی کے آثار ابھرے۔ پھر وہ درد سے بھری ہوئی ایک چیخ میں ڈوب گیا۔

"بولے سو نہال!" ایک طرف سے آواز آئی۔ ارے یہ تو لفٹیننٹ سرکار جے کارہ بلا رہا تھا۔

"ست سری اکال۔" سترہ اور گلوں سے جواب ملا۔

"گولیوں کی دنادن میں پہلی دو قطاریں کٹی ہوئی شاخوں کی طرح گر گئیں۔ باقی کے کچھ چینی گرے، کچھ بھاگے۔ ہم نے اب رائفلیں سنبھالیں۔ ایمونیشن کی بچت لازمی تھی۔ مجھے کسی اور کا پتہ نہیں تھا۔ میں نے اپنی رائفل سے کم از کم دس کو تو گرایا ہی ہوگا۔"

وہ پھر چپ ہوگیا۔ ساتھ والے بستر پر پڑا زخمی بار بار کراہ اٹھتا تھا۔ سوداگر سنگھ نے اس طرف دیکھا۔ ہمدردی سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ "چار دن پہلے میری بھی یہی حالت تھی۔ اب تو میں ٹھیک

ہوں۔" وہ بولا۔

میرے ہاتھ کی انگلیاں جیب میں پڑی ہوئی پنسل کو بار بار مروڑ رہی تھیں۔ اس کہانی میں سے کیا لکھوں، کیا چھوڑوں۔ لیکن ابھی کہانی مکمل ہی کہاں ہوئی ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

صوبے دار سوداگر سنگھ بولا: "اس پہلے ہلّے میں ہمارا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ جب دور گھاس اور جھاڑیوں میں رینگ رینگ کر بھاگتے ہوئے دشمن کی سرسراہٹ ختم ہو گئی تو ہم نے حالات کا جائزہ لیا۔ یہ درست تھا کہ ہم نے یہ ہلّہ پچھاڑ دیا تھا، اور دشمن کا بھاری جانی نقصان ہوا تھا، لیکن اب دشمن کو ہماری اس جگہ پر موجودگی کا پتہ چل گیا تھا اور ہم جانتے تھے کہ آنے والا حملہ پہلے سے شدید ہوگا اور اس میں ہم اتنی آسانی سے دشمن کا صفایا نہ کر سکیں گے۔"

"بھاگ سنگھ تیزی سے کہہ رہا تھا: "مینوں پہلے ہی پتہ تھا کہ سالے سب بھاگ جائیں گے!"

"کہیں دور سے ایک گولہ آیا اور ہم سے تین گز کے فاصلے پر گرا۔ ہم سب نیچے دبک گئے۔ شدید گولہ باری کا انتظار بالکل بروقت تھا۔ کیوں کہ ہم جانتے تھے کہ دشمن کی آرٹلری (توپ خانہ) ہم سے زیادہ سے زیادہ چار میل کے فاصلے پر ہے۔ لیکن کافی انتظار کے بعد بھی جب کوئی اور دھماکہ نہ ہوا تو ہم باتوں، قہقہوں، لطیفوں اور چلتے ہوئے فقروں کی لہریں بہہ گئے۔ صرف چھ آدمی کمال چوکسی سے چاروں طرف دور بینوں پر نظریں جمائے تھے۔

"دھوئیں سے سیاہ، دودھ کے بنا چائے کا جو مزہ خندق میں آتا ہے، وہ گھر کے دسترخوان پر ٹی کوزی سے ڈھکی چائے دانی سے انڈیلی ہوئی چائے میں کہاں؟ اس دوران میں سورج ایک بدلی کے پیچھے سے جھانکنے لگا۔ تبھی دور سے رائفل کی صرف ایک گولی کی آواز آئی۔ لفٹیننٹ سرکار گھٹنوں کے بل چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے جو تجویز، جو پلان مجھے بتایا اسے سن کر اور سمجھ کر میں عش عش کر اٹھا۔ خندق کے چاروں طرف بیس بیس گز کی دوری پر بے ترتیبی سے ہم نے چار فٹ گہرے گڑھے کھود رکھے تھے..... انھیں فوجی زبان میں ہم فاکس ہول یعنی لومڑی کا گھر کہتے ہیں۔ لفٹیننٹ سرکار کا خیال تھا کہ چوں کہ دشمن کو اب ہمارے ٹھکانے کا علم ہے اور اسے یہ بھی پتہ ہے کہ ہمارے پاس بھاری ہتھیار نہیں ہیں، اس لیے وہ دور مار توپوں سے اس ٹھکانے پر بھاری گولہ باری کرے گا۔ ایسی حالت میں ہمارا جانی نقصان ہوگا اور ہم دشمن کو آگے بڑھنے سے بھی روک نہیں سکیں گے۔ پلان کے مطابق ہم

سب ایک ایک کر کے ان گڑھوں میں اپنے ہتھیاروں اور گولہ بارود کے ساتھ گھس گئے اور خندق کو خالی چھوڑ دیا۔ ٹھیک تین بجے دُور مار توپوں کے گولوں کی ایک بوچھار آئی اور سیدھی ہماری خندق سے ٹکرائی۔ اس کے بعد آدھ گھنٹے تک بھاری گولہ باری کا طوفان مچا۔ ہم چوکس لیکن دبکے پڑے رہے۔ اس گولہ باری کے دَوران میں بھی لفٹیننٹ سرکار ایک ماہر کھلاڑی کی طرح ایک گڑھے سے دوسرے اور وہاں سے تیسرے میں جوانوں کا حوصلہ بندھانے کے لیے جاتا رہا۔ جب اُڑتے ہوئے گولے کے ایک ٹکڑے نے حوالدار عطر سنگھ کو شدید زخمی کیا تو لفٹیننٹ سرکار اسی کے گڑھے میں اس کی مشین گن سنبھالے اسے حوصلہ دیتا رہا۔

" آدھ گھنٹے کے بعد اسی طرح دُور سے دشمن آتا دکھائی دیا۔ چینی سپاہی اب بہت پھُونک پھُونک کر آگے آ رہے تھے۔ پھر حکم نشر ہوا "میرے حکم کے بغیر کوئی گولی نہ چلانے پائے۔" ہم سب تاک اور انتظار میں تھے۔ پانچ منٹ، دس منٹ، آدھا گھنٹہ ..... اس کے بعد دُور مار توپوں کی گولہ باری کا جوش کچھ ٹھنڈا ہوا۔ ہماری خالی کی ہوئی کھائی اب ادھڑی پڑی تھی۔

'اب وقت ہے ان کے ہلّے کا۔' میں نے دل میں کہا۔

" اور واقعی اسی وقت مجھے اپنے سے صرف چالیس گز دُور دشمن کے سپاہیوں کے آگے بڑھنے کی سرسراہٹ سُنائی دی۔ غور سے دیکھنے پر ان کے سر نظر آئے۔ وہ بہت آہستگی سے رینگ رہے تھے۔ میں نے ہاتھوں کو کٹ کٹایا۔ ساتھ والے فاکس ہوم میں رام سنگھ نے سنا، اور پیغام اسی طرح آگے بڑھا دیا۔ ہم دشمن کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ دو تیس گز کی دُوری پر دشمن صاف نظر آنے لگا۔ ان کی نظریں اب تک اُدھڑی ہوئی کھائی کی طرف تھیں۔ میں نے اسی طرح ایک گولائی میں آتے ہوئے پندرہ بیس چینیوں کو تاکا۔ تب ہی لفٹیننٹ سرکار کے گڑھے سے زور کا حکم ہوا۔

'فائر!'

" اس کے بعد کیا ہوا، میں پوری طرح نہیں بتا سکتا۔ میں نے بلبلی دبائی اور گن کا منہ گھماتا گیا۔ ایک چینی گولی کھا کر چھ فٹ اُچھلا اور پھر گر پڑا۔ میں نے صرف یہ محسوس کیا کہ چینی پیچھے بھاگنے کی بجائے اب پتھروں اور گڑھوں کی اوٹ میں پناہ لے رہے ہیں۔ ایک دو تو واقعی لیٹ کر گولی بھی

چلا رہے تھے۔ میں نے اب رائفل اُٹھالی۔ ایمونیشن کی بچت کرنا اس صورت میں اور بھی ضروری ہو جاتا ہے جب کمک پہنچنے کی امید بالکل نہ ہو۔ ایک.... دو.... تین.... چار — ہر فائر کے بعد میرا حوصلہ دوچند ہو اُٹھتا۔

"اسی وقت میں نے دیکھا، نایک چکرّ دھاری کے فاکس ہول سے صرف دس گز کے فاصلے پر کئی چینی سپاہی بڑھ رہے ہیں۔ دوسرے لمحے چکرّ دھاری کا گھومتا ہوا دایاں ہاتھ دکھائی دیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو گرینڈ پھینکے اور بڑھتے ہوئے چینی فوجی خون اور مٹی کے ڈھیر میں دب گئے۔ تبھی میں نے جیسے آگ کا ایک دریا اپنے بازو میں محسوس کیا۔ ایک لمحے کے لاکھویں حصّے کے لیے میری نظر اپنے بازو کی طرف گئی جو گرم فوجی کوٹ کے نیچے اب ڈھیلا سا لٹک گیا تھا۔ پھر مجھے آنکھوں کے سامنے دُھند سی دِکھائی دینے لگی۔ نیلے پیلے طوطے ناچنے لگے۔ اور میں بے ہوش ہو گیا۔

"جب مجھے ہوش آیا تو رات کا اندھیرا تھا۔ میرے بازو میں بَلا کا درد تھا۔ میرے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں کوئی ٹکڑا چُبھا تھا، لیکن اس کا درد تو دوسرے اور آدھ کٹے بازو کے درد کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں کراہا، تو مجھے لگا جیسے مکھّیوں کی بھنبھناہٹ یکایک رُک گئی ہو۔

'شکر ہے واہگورو کا!' مجھے دائیں طرف سے آواز آئی۔ رام سنگھ کہہ رہا تھا 'صوبے دار صاحب کو ہوش آیا ہے!' کئی ہاتھ مجھ تک پہنچے۔ میں نے محسوس کیا کہ اب میں پھر پرانی خندق میں ہوں۔ دُور سے گولی چلنے کی اِکّا دُکّا آواز آرہی تھی۔ اس کے سِوا ہر طرف خاموشی تھی۔ تبھی لفٹیننٹ سرکار گھٹنوں کے بَل چلتا میرے پاس آیا۔ میرا دایاں ہاتھ سہلاتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ چینی کافی بھاری جانی نقصان کے بعد پھر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ اب اگر رات بہ خیریت گذر جائے تو صبح تک کمک کی امید کی جاسکتی ہے۔ فیلڈ ٹیلیفون اگر ٹھیک ہوتا تو پیچھے رپورٹ پہنچائی جا سکتی تھی۔ صبح تک کسی اور حملے کی امید نہیں ہے۔ انھیں بھی تو سنبھلنے کے لیے وقت چاہیے۔!

"ہمارا کیا حال رہا۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"جیسے کوئی غلط سوال کر دیا ہو، کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر رام سنگھ نے کہا۔ 'ہم سات آدمی باقی ہیں۔'

"کون کون سے....؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"لیکن جواب سے پہلے ہی لفٹیننٹ سرکار نے کہا، کیا فرق پڑتا ہے صوبے دار صاحب: ہم میں سے ہر ایک پچاس دشمن مار کر مرا ہے!"

"اور رام سنگھ گوربانی سے گورو گوبند سنگھ صاحب کی بانی دھیرے دھیرے گنگنانے لگا۔

چڑیوں سے میں باز بھڑایو سوا لاکھ سے ایک لڑائیو
تبھی گوبند سنگھ نام رکھائیو"

صوبیدار سوداگر سنگھ گنگناتے ہوئے بانی پڑھ چکا تو جیسے اُس کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی۔ گوربانی کا جاپ سن کر ساتھ کے بیڈ والا زخمی بھی کراہنا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ سارے وارڈ میں سناٹا چھا گیا۔ اپنی لے کے ختم ہونے کے بعد سوداگر سنگھ پھر چپ ہو گیا۔

"میرے بازو کو انھوں نے کس کر باندھ دیا تھا اور پگڑی سے گلے میں لٹکا دیا تھا" اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "رات دھیرے دھیرے گذرتی رہی۔ ہمارے شمال مشرق میں کسی چوکی پر شدید حملہ ہو رہا تھا کیوں کہ گولے پھٹنے کے دھماکوں سے زمین دہل رہی تھی۔ میں عین بیچ میں مٹی کے تیل سے جلنے والے بغیر آواز کے سٹوو کے پاس بیٹھا تھا۔ ہمارے جوان ہر دس منٹ کے بعد اپنے چاروں طرف ڈھلانوں کے اوپر ہوائیاں پھینک رہے تھے، جس سے کہ وہ خود اندھیرے میں رہتے لیکن ان ڈھلانوں پر اس قدر چکا چوند روشنی ہو جاتی کہ چینیوں کے چھپ کر آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سات آدمیوں نے جس طرح ہو سکا خندق کی مرمت کر لی تھی۔ جب تک ایک بار پھر اسی طرح کی بھرپور گولہ باری نہ ہوئی۔ ہم وہاں محفوظ تھے۔ گولہ بارود کی بہتات ہوتی تو ایک پوری فوج ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔
پو پھٹی۔ گھاس کی پتیوں پر اوس چمک رہی تھی۔ ہوا میں شدید ٹھنڈ تھی۔ ذرا اونچائی پر برف پڑی دکھائی دیتی تھی۔ ہم سب ٹھٹھرنے لگے۔ میرا بازو اکڑ گیا۔ ہوش اور بے ہوشی یکے بعد دیگرے طاری ہوتی رہی۔ ایک بار دور سے ہیلی کوپٹر کی آواز بھی آئی، لیکن فوراً بعد چینی ٹھکانوں سے اینٹی ایئر کرافٹ بندوقیں اور ریکائیل لیس رائفلوں سے گولیوں کی بوچھاڑیں آئیں۔ شاید ہماری طرف آنے کی کوشش کرتا ہوا ہمارا اپنا ہیلی کاپٹر واپس چلا گیا۔۔۔ سورج کا سنہرا پگھلتا ہوا تھال ابھی اُفق سے نمودار ہی ہوا تھا کہ چینیوں کا بڑا حملہ شروع ہو گیا۔

میں اس میں بالکل حصّہ نہ لے سکا لیکن دُنادُن فائرنگ کے دَوران میں بھی لفٹیننٹ سرکار اپنے کام میں نہ لگے ہوئے ہاتھ سے مجھے تھپکیاں دیتا رہا۔ ایک بار جب درد کی شدّت سے میرا سر ایک طرف کو لڑھک گیا تو وہ سرکتا ہوا میرے پاس آیا۔ "صوبے دار صاحب! گھبراتا کاہے کو ہے۔ سب ٹھیک ٹھیک ہو جائے گا!"

"میرا ہاتھ.... میرا ہاتھ!" میں نے کوٹ کی باہنہ سے لٹکتے ہوئے اپنے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ جو شاید اس وقت صرف ماس کے تاگے کے سہارے بندھا تھا۔ تب اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام کر کہا۔ "پنجاب اور بنگال کے ہاتھ جب مل جاتے ہیں تو ایک کے کٹنے پر دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔"

صوبے دار سوداگر سنگھ چپ ہو گیا۔ فولادی چمک، جس سے اس کی آنکھوں میں پانی پیدا ہوا تھا، ایک بار جھلملا کر بجھ گئی۔ اس کا کانپتا ہوا ہاتھ پھر سُرخ کمبل کے نیچے چلا گیا۔ آہستہ سے اس نے کہا۔ "اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ایک دوسری کہانی ہے۔ بارہ گھنٹوں کی مسلسل گولہ باری کے بعد بھی جب ہمارے جوانوں نے دشمن کو چوشول کی طرف بڑھنے کے لیے راستہ نہ دیا تو ان کے ٹینک حرکت میں آئے۔ تب میں نیم ہوش اور نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ سات جوانوں میں سے چار شہید ہو چکے تھے۔ جو تین باقی تھے لفٹیننٹ سرکار سمیت وہ سخت زخمی تھے۔ ٹینکوں کے لڑھکتے ہوئے دیوزاد رولروں کے نیچے کچھ نہ بچا۔ میں نہ معلوم کس طرح پڑا تھا۔ چینی مجھے مُردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ تین دن کی مشقت کے بعد اونچی نیچی دھرتی پر رینگتا میں سات میل دُور ایک دوسری چوکی پر پہنچا، جہاں سے ہیلی کوپٹر کے ذریعے مجھے یہاں لایا گیا ـــــ لیکن یہ تو ایک تیسری کہانی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

○○

مٹّی کے کھلونے

بخت کے ہاتھ لرز اٹھے، جیسے وہ اس کی آواز کو اپنی انگلیوں کی پوروں کے لمس سے محسوس کر رہا ہو۔ اس نے غور سے سنا، آواز نسوانی تھی، بہت مہین تھی اور اتنی پیاری تھی کہ وہ درختوں کے جھنڈ کو پار کر کے جھانکے بغیر نہ رہ سکا۔

سامنے سانسیوں کے تمبو لگے ہوئے تھے۔ شاید ان کا قافلہ رات ہی یہاں اترا تھا۔ کچھ میلے کچیلے بچے کھیل رہے تھے۔ ایک طرف بیٹھی ہوئی ایک لڑکی ہاتھ سے مٹی رُل رُل کر انہیں کھلونوں کی شکل دے رہی تھی۔

لڑکی بہت خوب صورت تھی۔

لڑکی بہت ہی خوب صورت تھی۔

اس کا سیاہی مائل گندمی رنگ کپڑوں سے جھانک رہا تھا، اس کا گریبان کھلا تھا۔ لہنگا ذرا سا اٹھا ہوا تھا۔ اس لیے بخت کو آسانی سے اس کے ٹخنوں کی ایک جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس کی بانہوں میں چوڑیاں تھیں۔ کلائیوں سے لے کر بازو کی مچھلیوں تک سبز رنگ میں بیل بوٹے کھدے تھے۔ خانہ بدوش لڑکیوں کی طرح اس کے بال کھلے تھے اور ان میں مہین مہین موتی پروئے ہوئے ایسے لگتے تھے جیسے لمبے، سیاہ، باریک تاروں سے چمکتے ہوئے رنگ برنگے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔ لڑکی

گا رہی تھی، اور اس کا گلا اتنا میٹھا تھا کہ بخت سانس روکے اس کی آواز کی لے کے ساتھ بہتا رہا۔ گیت کے بول اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن لڑکی گا رہی تھی اور لڑکی سر تا پا ایک گیت تھی۔ بہار کی مستی میں ڈوبا ہوا ایک سہاونا گیت، جیسے ایک اکیلی شہد کی مکھی، گرمیوں کی بھری دوپہر میں ایک مونہہ بند کلی کا رس چوسنے کے لیے اس کے کھلنے کے انتظار میں گاتی رہے۔

گیت ختم ہوا تو بخت کو یاد آیا کہ اس کا جڑواں بھائی تخت اس کے انتظار میں دریا کے کنارے کھڑا ہے۔ لیکن وہاں سے جانے کو اس کا جی نہ چاہا۔ اس نے دھیرے سے پاؤں اٹھایا اور ایک ہلکے سے کنکر کو ٹھوکر ماری۔

لڑکی نے سر اٹھایا۔ سیاہ آنکھوں میں یک بارگی چمک پیدا ہوئی اور پھر بجھ گئی۔

"کون ہو تم؟" چمک نے سوال کیا۔

"راہی ہوں . . . . راستہ بھول گیا ہوں۔" وہ مسکرایا "تم کون ہو؟"

اس نے حیرت اور ڈر کے ملے جلے جذبات سے ایک نگاہ اپنے خیموں کی طرف اٹھائی اور پھر جیسے اس ماحول کے اپنے پن سے متاثر ہو کر اس نے ادھ بنا کھلونا رکھ دیا، ٹانگیں پسار کر بیٹھ گئی، ذرا سا مسکرائی اور پھر بولی "دکھائی تو تم اسی گاؤں کے دیتے ہو۔ تمہارے پاس خچر یا گھوڑی نہیں ہے، چلنے کے لیے لاٹھی تک نہیں۔ لانگڑ تمہاری میلی ہے، اور گیلے بالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی نہا کر آ رہے ہو . . . ." پھر وہ کھلکھلا کر ہنسی "میرا نام شیشو ہے۔ میں کیتکی کی بیٹی ہوں!"

بخت کو محسوس ہوا جیسے اس کے بخت جاگ اٹھے ہوں۔ وہ اس وقت اپنے جڑواں بھائی تخت کو بھول گیا، جو دریا کے کنارے اس کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ وہ پہنچے اور دونوں منڈی سے مویشی خریدنے کے لیے ساتھ کے گاؤں میں جا سکیں۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ زمیندار کا بیٹا ہے اور وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس کا باپ نتھو رام ایک ظالم باپ ہے اور اس سے بھی ظالم زمیندار ہے ـــ اسے صرف یہ یاد رہا کہ شیشو شیشے میں اتری ہوئی ایک ایسی پری ہے جو اس کے سوئے ہوئے بخت کو کندھوں سے پکڑ کر جگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسے صرف یہ یاد رہا کہ لڑکی کمال کی ذہین اور ہوشیار ہے، بلا درجے کی چالاک اور حاضر جواب ہے، بے انتہا شوخ ہے اور اسے صرف یہ یاد رہا کہ اس نے اپنی بائیس سالہ زندگی میں اس قماش اور طبیعت کی کوئی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ نہ کہہ سکا۔ پھر اس نے خیمے کے باہر بھٹی میں پکتے ہوئے مٹی کے کھلونے دیکھے۔ ہاتھی، گھوڑے، گھگھو، سانپ، اور لاتعداد پرندے اسے بات سوجھی لیکن بعد میں، لیکن جواب اسے پہلے مل گیا۔

شیشو نے کہا "آؤ تمہیں کھلونے دوں، دو آنے کے، یا چار آنے کے؟"

وہ مٹی کے کھلونے خریدتا رہا۔

تخت اور بخت!

دریا کنارے کھڑے ہوئے تخت نے سوچا، بخت اب نہیں آئے گا۔ شاید اسے باپ نے واپس بلا لیا ہے یا شاید وہ کھیتوں کی طرف ہی چلا گیا ہو۔ منڈی سے بیل خریدنے کے لیے روپے اس کے پاس تھے ہی۔ اس لیے وہ اکیلا ہی چلا گیا۔ اتفاق سے وہاں کوئی کام کا سودا نہ بنا، اس لیے وہ جلد ہی لوٹ آیا۔ گاؤں میں اپنی حویلی تک پہنچنے کے لیے اسے درختوں کے اسی جھنڈ میں سے گزرنا تھا، جہاں خانہ بدوش سانسیوں کے خیمے گڑے تھے۔ وہ اپنے خیالوں میں مست بھونکتے ہوئے کتوں، کڑکڑاتی ہوئی مرغیوں اور کھیلتے ہوئے ننگ دھڑنگ بچوں سے بچتا ہوا آگے بڑھا۔ یکایک وہ ٹھٹھکا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سمجھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ ایک جوان لڑکی مٹی میں چاروں شانے چت لیٹی سینے سے ایک بکری کا میمنا لپٹائے سو رہی تھی۔

تخت کھڑا کھڑا ہی چت ہو گیا۔

لڑکی بھرپور جوان تھی۔ اس کے چہرے پر تنفس کی گرمی سے پسینے کی ہلکی ہلکی بوندیں ابھر آئی تھیں اور . . . . اور تخت کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسے جگائے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ وہ کھنکارا

لڑکی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ حیرت سے آنکھیں ملتے ہوئے اس نے تخت کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوف زدہ ہرنی کی طرح بے قراری سے پھڑکنے لگیں۔

"تم، تم . . . . تم ابھی یہاں تھے؟" وہ کنمنائی۔

تخت ہمت ہارنے والا نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس نے کہا "اور تم سو رہی تھیں"۔

شیشو کا حوصلہ لوٹ آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن وہ اب بھی اسے بخت ہی سمجھ رہی تھی۔ دونوں

کے خدوخال اس حد تک ملتے تھے کہ ناواقف آدمی کے لیے دھوکا کھانا آسان تھا۔ اس نے پھر کہا
"لیکن تم ابھی تو لانگڑ پہنے تھے، اور سر پر بھی پگڑی نہیں تھی، اور تم نے کھلونے بھی تو خریدے تھے ....
اور تم نے کہا تھا کہ نتھو رام زمیندار کے لڑکے ہو، جو چکیری کا لمبردار بھی ہے۔"

تخت سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں بخت کو کوسا۔ پھر آگے بڑھ کر شیشو کے پاس مٹی میں ہی بیٹھ گیا۔ اس نے بجری کا بچہ اس سے لے لیا، اسے چوما، پھر واپس کرتے ہوئے بولا "گاؤں آؤ گی تو میری ڈیوڑھی پر بھی آنا۔ میں بھی کھلونے خریدوں گا اور زیادہ پیسے دوں گا۔ میں اس کا بھائی ہوں!"

وہ بھی مٹی کے کھلونے خریدنے کے لیے بیتاب تھا!

اور شاید وہ دام بھی زیادہ دے سکتا تھا، کیوں کہ اناج کی رسید، خرید اور بجری کا حساب ہمیشہ اسی کے پاس رہتا تھا۔ اس لیے اس نے شیشو کے بازوؤں پر کھدے ہوئے بیل بوٹوں کے نقوش کو اپنی انگلی سے سہلایا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، لیکن وہ ہنس پڑی۔

شیشو نے کہا "میں کانچ نہیں پہنوں گی، تم مجھے گاؤں کے سنار سے کڑے بنوا دینا!"

اس نے پوچھا "مٹی کے کھلونوں کے بدلے میں؟"

اور وہ دونوں ہنس پڑے۔

شیشو، جو نہائے تو پانی کو غش آجائے۔ شیشو، جو چلے تو مور اپنی چال بھول جائیں، شیشو، جو آئینہ دیکھے تو اس میں بال آجائے۔ شیشو، جوانی اور خوب صورتی کا وہ خمار، جو تخت اور بخت دو جڑواں بھائیوں کے ذہنوں پر دھند کی طرح چھا تا گیا۔ شیشو کے چرچے ہوئے۔ شیشو کی بات چلی۔ شیشو کا ذکر چھڑا۔ کنواں، چوپال، گھر، گلی اور آخر میں لمبردار نتھو رام کی بیٹھک میں بھی۔

لیکن جوان بیٹوں کے مونہہ لگنا اور انہیں جھڑکیاں دینا اور اپنا فرض اور قدرت سمجھتے ہوئے بھی نتھو رام نے عقل مندی سے کام لیا۔ گھر برباد ہو جائے گا، اس نے سوچا۔ شیشو اس شیشے کے گھر کی دیواروں میں دراڑیں ڈال دے گی۔ کھتری ٹھاکر کے چوبارے کو سانسی خانہ بدوش موری کی اینٹ کا پیوند لگ جائے گا۔ اس لیے وہ خاموش رہا۔

تخت نے شیشو کو چاندی کی ہنسلی بنوا دی، تو بخت نے اپنی ماں کا کانٹا چرا کر اسے انگوٹھی

گھڑوا دی۔ تخت نے اسے جے رام بزاز کی دوکان سے رنگ برنگی چھینٹ کا ڈھیر لا دیا تو بخت نے فضل موچی سے زری کی ایسی جوتی بنوائی کہ اس کی اپنی منگیتر ستّ بھرائی کو حسد کے مارے تین راتوں تک نیند نہ آئی۔ جب اسے ایک بار موسمی بخار ہوا تو جہاں تخت گھوڑی پر چڑھ کر سات کوس دور سے حکیم صاحب سے دوا لایا، وہاں بخت ٹھاکر صاحب کی بگھی مانگ کر قصبے سے کونین کی کڑوی گولیاں لے آیا۔

اور یہ سب اس لیے کہ خود شیشو ہی اب تک یہ فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ وہ کس بھائی کے گلے کا ہار بنے گی۔ اس کے قبیلے کے لوگوں کا تو پیشہ ہی یہی تھا۔ جرائم پیشہ قبیلوں میں عزت کی بہت قدر کی جاتی ہے، لیکن صرف اسی حد تک جہاں تک مناسب قیمت نہ ملے۔ مناسب قیمت پر یہی آبرو، یہی عزت، ان مٹی کے کھلونوں سے بہتر نہیں سمجھی جاتی، جو وہ بیچتے ہیں ـــ اس لیے اس کی ماں کیتکی جو کل تک دو وقت کا مناسب کھانا بھی نہ کھا پاتی تھی، اب نئے نئے چھینٹ کے کپڑوں میں لپٹی دوسری عورتوں کے سامنے سے گزرتی تو قبیلے کی دوسری عورتیں رشک اور حسد کے مارے جل بھن جاتیں اور اپنی لڑکیوں کی طرف دیکھتیں جو کوٹھے کوٹھے جتنی بڑھ کر بھی اپنے میں وہ کشش نہ پیدا کر پائی تھیں، جو مردوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

حیرت البتہ ایک بات کی تھی۔ فیصلہ شیشو کے ہاتھ میں ہوتے ہوئے بھی تخت اور بخت کو آپس میں لڑنے سے روکنے والا کون تھا؟ لیکن نہ صرف ان کے ماں باپ نے بلکہ سارے گاؤں والوں نے انہیں اسی طرح بھائیوں کی مانند گھومتے دیکھا، باتیں کرتے ہوئے سنا اور صلح صفائی سے رہتے ہوئے پایا ـــ اس لیے جب ایک شام گاؤں میں بندوق کا فائر ہوا تو سبھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

شیشو اپنے خیمے سے باہر درخت کی چھاؤں میں بیٹھی تھی۔ تخت اس کے پاس تھا۔ وہ حسبِ دستور شیشو کے سڈول بازوؤں پر کھدے ہوئے نقوش کو اپنی انگلیوں سے سہلا رہا تھا۔ بار بار جب اس کا ہاتھ اوپر پہنچتا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور بازو چھڑاتے ہوئے کہتی "بند کرو، مجھے گدگدی ہوتی ہے!"

"گدگدی تو ہوتی ہی ہے!" ایک آنکھ بند کرتے ہوئے تخت ماہرِ فن بدمعاشوں کی طرح کہتا۔

لیکن وہ بد معاش نہیں تھا اور اس بات کا علم شیشو کو بھی تھا۔ اس لیے اس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اپنی تازہ ترین فرمائش دہرائی۔

"مجھے باتیں کرنے والا باجہ چاہیے" اس کا مقصد گراموفون سے تھا۔

"اور پوں پوں والا باجہ لا دوں تو؟" بخت نے ہارمونیم کی بات کرتے ہوئے اسے پھر چھیڑا۔

وہ ہنسی اور اس کے سونے کی کیلوں والے دانت نمایاں ہو گئے۔ "تم نہیں لاؤ گے تو میں تمہارے بھائی سے کہوں گی۔" اس نے دھمکی دی اور پھر جیسے اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

یکایک انہیں غرانے کی آواز آئی۔ سامنے جھاڑی کے باہر تخت کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں بندوق تھی۔ وہ غصّے سے کانپ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا تھا اور سانس چڑھا ہوا تھا۔ اس نے شاید اپنے بھائی کو شیشو کے بازو سہلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور شیشو کے غصّے میں اٹھنے کے فعل کو اس کی ناپسندیدگی کی علامت سمجھ بیٹھا تھا۔

اس نے بندوق تان کر ایک ہوائی فائر کیا۔ پھر بندوق ایک طرف پھینک دی اور اپنے بھائی پر پل پڑا۔

تخت اور بخت مٹّی میں لوٹتے ہوئے ہاتھوں، پیروں اور دانتوں سے لڑ رہے تھے اور جب گاؤں کا پہلا آدمی وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ شیشو بھاگ کر دور اپنے خیمے کی اوٹ میں جا چھپی ہے اور وہاں سے تماشہ دیکھ رہی ہے۔

لمبردار نتھو رام نے سوچا کہ اب پانی سر سے گزر گیا ہے۔ اس نے دونوں لڑکوں سے مل کر اس بات کا فیصلہ کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اس نے دونوں کو بلایا۔ ان کی ماں کو بھی سامنے بٹھایا اور بات شروع کی۔

لیکن زندگی میں پہلی بار اسے اس بات کا پتہ چلا کہ دل کا یہ معاملہ خاندانی روایات کی قربانی دے کر آگے بڑھا ہے، اور اب اس کے ذاتی وقار کی قربانی دے کر اختتام تک پہنچے گا۔ تمتماتے ہوئے چہروں لیکن کڑے ہونٹوں سے دونوں بھائیوں نے اپنی صلح کی شرائط سامنے رکھ دیں۔ پہلی شرط شیشو سے شادی کی تھی اور دوسری گھر جائداد میں الگ حصہ پانے کی۔ نتھو رام بہت ٹپٹایا۔ اس

نے ہزار کوشش کی کہ معاملہ سلجھ جائے۔ لیکن بے سود۔ دل ہی دل میں وہ حالات سے اس حد تک سمجھوتہ کر چکا تھا کہ اگر ان میں سے ایک شیشو پر اپنے حق کو چھوڑنے پر تیار ہو جائے، تو دوسرے کے ساتھ واقعی اس کی شادی کر دی جائے، لیکن یہاں تو سوال تھا، شیشو پر ازدواجی قبضہ کا . . . . اور شیشو وہ پری تھی جو صرف شیشے میں اترتی ہے، حقیقی زندگی میں مادی شکل اختیار نہیں کرتی۔

پھر اسے ایک بات سوجھی۔ اس نے کہا "شیشو تم میں سے کسے زیادہ چاہتی ہے؟"

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر بخت نے کہا "مجھے! وہ مجھ سے کئی بار اس کا اقرار کر چکی ہے!"

تخت نے حقارت آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر کہا "جھوٹ بکتا ہے یہ! شیشو سے پہلے میں ملا تھا۔ اس لمحے سے لے کر اب تک وہ مجھ سے عشق کرتی رہی ہے۔ یہ تو اسے ورغلانے کو پھرتا ہے۔"

لیکن نتھو رام نے بات بہت سوچ سمجھ کر کی تھی۔ اس لیے اس نے کہا "اور اگر یہ بات اس لڑکی سے ہی پوچھ لی جائے تو؟ اس کا باپ سانسی کمین سہی، لیکن آخر باپ ہے۔ سنا ہے، اس نے ماں بیٹی کو چھوڑ رکھا ہے اور قبیلے کی کسی دوسری عورت کے ساتھ رہتا ہے۔ اسے بھی بلا لیں گے۔ میں بھی وہیں ہوں گا، اور فیصلہ ہو جائے گا!"

بات طے ہو گئی۔ دونوں بھائیوں نے شیشو کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا وعدہ کیا۔ تخت نے کہا کہ اگر شیشو نے اس سے ناطہ نہ جوڑنے کا فیصلہ کیا تو وہ کان چھدوا کر اور مندریں ڈال کر جوگی ہو جائے گا اور جائداد میں بھی کسی قسم کا تعلق نہیں رکھے گا۔ بخت نے کہا اگر شیشو نے اپنی نظر عنایت اس کی طرف نہ کی تو وہ بھرتی ہو کر سمندر پار چلا جائے گا ـــ نتھو رام کا خیال تھا کہ فیصلہ ہو چکنے کے بعد وہ دوسرے لڑکے کی شادی کہیں اور طے کر کے اسے کوئی غلط قدم اٹھانے سے باز رکھ سکے گا ـــ اس لیے اس نے اس فیصلہ کن ملاقات کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔

لڑکی بہت خوب صورت تھی، اس بات کا احساس نتھو رام کو بھی ہوا۔ پچیس برس تک ایک بیوی کے ساتھ بیاہے رہنے کے بعد اسے احساس ہو چلا تھا کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے، لیکن شیشو کے جسم اور اس کی اداؤں کو دیکھ کر خون کی جس لہر نے اس کے جسم کو گرمایا، اسی نے اس کے دل میں بھی کچھ

دلوے پیدا کر دیے۔ اس کے خاندان کی قسمت کا فیصلہ جس لڑکی کے ہاتھ میں تھا، وہ سامنے تھی اور نتھو رام کو دل میں یوں محسوس ہوا، جیسے اس کے دعوے دار دو نہ ہوں، بلکہ تین ہوں۔

لمبردار کو اپنی طرف ٹکر ٹکر دیکھتے پاکر شیشو کو حیرانی سے زیادہ راحت کا احساس ہوا۔ لیکن اسے اپنی طاقت کا علم پہلے سے ہی تھا، اس لیے وہ اور زیادہ ہوشیار ہو گئی۔ اس کا باپ اور اس کی ماں اپنی کامیابی کے نشے سے مسرور ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔ نتھو رام کے دونوں لڑکے اور خود نتھو رام دوسری چارپائی پر تھے۔ شیشو پیڑھی پر بیٹھی تھی، لیکن اس کی بیباک نگاہیں ہر چہرے پر پھسل رہی تھیں۔

اس نے دو ٹوک اپنا فیصلہ سنایا "جو اپنے حصے کی آدھی جائداد ابھی سے میری اولاد کے نام لکھ دے!"

شیشو کا باپ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا رہا۔ شیشو کی ماں نئی چھینٹ سے بنی ہوئی شلوار کے بیل بوٹے دیکھتی رہی، لیکن تخت اور بخت کا سارا عشق ہوا ہو گیا۔ انہوں نے ایک نظر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ غصے سے لال بھبھو کا چہرہ لیے ان کا باپ مرنے مارنے کو تیار ہو گیا ہو گا۔

لیکن نتھو رام عجیب نظروں سے ان کی مشترکہ محبوبہ کو دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے دونوں بیٹوں کی طرف حقارت آمیز نظروں سے دیکھا۔ اپنا ہاتھ بندوق کے دستے پر مضبوطی سے رکھا، پھر شیشو کی طرف دیکھ کر بولا "اور اگر کوئی اپنی پوری جائداد تمہاری ہونے والی اولاد کے نام لکھ دے تو؟"

○○

اپنی اپنی زنجیر

کالی آنکھوں میں کوندا سا لپکا۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے ایک لمحے میں ایک صدی گزر گئی ہو اور دو غزال چوکڑی بھرتے، پہاڑوں کی چوٹیوں کو پھلانگتے ہوئے دُور نکل گئے ہوں۔

میں نے کہا "مارگریٹ، پہاڑ تو ان سیاہ قوی ہیکل دیووں کی طرح ہیں جو خوب صورت شہزادیوں کو اپنے قلعوں میں قید رکھتے ہیں۔ اب دیکھیے نا، کالگیری ایک پہاڑی شہر ہے، راکی پہاڑیوں کے کینیڈین سلسلے کے بیچوں بیچ ایک قلعہ جیسا۔ یہاں کے رہنے والے تو ایک نظر میں ہی پہچانے جاتے ہیں، لیکن اس ٹورسٹ سیزن میں باہر سے آئے ہوتے سیّاحوں میں زیادہ تعداد خوب صورت دوشیزاؤں کی ہے۔ اور آپ بھی تو ان ہی میں سے ایک ہیں۔"

اس بار سفید موتیوں کی لڑیوں جیسے دانت اچانک چمک اٹھے۔ وہ مسکرائی۔ پھر آہستہ سے ہنسی "مگر میں تو اس شہزادی کی طرح ہوں جسے ہر برس اس کا شہزادہ ان دیووں کی قید سے آزادی دلا کر دوبارہ میدانوں اور شہروں کی طرف لے جاتا ہے اور جو ہر برس پھر خوشی خوشی ان کی قید میں بن بلائے آجاتی ہے۔"

"اور وہ شہزادہ اس برس کون ہے؟"

شاید اسے میرے لفظوں میں طنز کی جھلک نظر آئی۔ وہ سنبھل گئی اور تہذیب اور اخلاق کی

اس زبان میں جسے ہم "کنگس انگلش" کہتے ہیں۔ بولی معاشارے کی زبان میں بات کرنا ایک طرح مناسب بھی ہے اور غیر مناسب بھی۔ دیکھئے نا، اب آپ میرا مطلب غلط سمجھ گئے "۔

میں نے دو سگریٹ سلگائے۔ ایک اسے دیا، جسے اس نے اپنے پتلے، نرم ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں میں تھام لیا۔ دوسرا ہونٹوں میں لے کر میں نے لگاتار چار پانچ کش لیے۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ "کل پیپر" ہوٹل کی سیڑھیوں تک پھیلے اور "چیرنگ کراس" کو غلاف میں لیے ہوئے بادل اب میرے دماغ سے چھٹ گئے ہیں تو میں نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی۔

"کاویہ مٹی کومل سی ناری" مجھے اپنی ایک ہندی غزل کا ایک مصرع یاد آیا۔

لمبی، خوب صورت، نرم ونازک سی ایک گوری لڑکی، جسے بہت آسانی سے غلط سمجھا جاسکتا تھا۔ جو دو گھنٹے پہلے مجھ سے متعارف بھی نہیں تھی۔ میری شکل بھی جس کے لیے اجنبی تھی۔ اپنا نام مارگریٹ کاروسکی بتانے کے بعد جس نے میرا نام ابھی تک نہیں پوچھا تھا۔ صرف یہ پوچھا تھا کہ میں عرب ہوں یا ہندوستانی یا ایرانی۔ پہلی بار مجھے اس کے گورے رنگ اور سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر یہ گمان ہوا تھا کہ وہ اطالوی ہسپانوی ہے، لیکن نام کی مناسبت سے اس کے جرمن یا ہنگرین یا پولش ہونے کا ثبوت ملتا تھا۔ جس نے ہاتھ ملانے کے بعد ایک ساتھ کافی پینے کی دعوت فوراً قبول کرلی تھی۔

لمبی، خوب صورت، نرم ونازک سی ایک گوری لڑکی۔ جو اگر گوری نہ ہوتی تو ہندوستانی حسن کا بہترین نمونہ تصور کی جاتی۔ پہلی بار وہ مجھے ان خوب صورت لڑکیوں کی طرح ہی دکھائی دی تھی۔ جن کو دیکھتے ہی ذہن میں چغتائی کی تصویروں کے ہلکے ہلکے نقش تیرنے لگتے ہیں۔ لمبی، پتلی کمان سی، خم کھائی ہوئی بھویں۔ غزالوں کی آنکھوں اور ان میں خوابیدہ سی شبیہہ، جیسے وہ آنکھیں آس پاس کے ماحول سے کہیں دور کچھ اور بھی دیکھ رہی ہوں۔

اور یہ "کاویہ مٹی کومل سی ناری" اب میرے ساتھ "کل پیپر" ہوٹل کے پارلر میں بیٹھی تھی۔ اور ہم کافی پی رہے تھے۔

"تم نے میرا نام تو پوچھا ہی نہیں "۔ میں نے پوچھا۔

وہ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ایک گورے نوجوان کی طرف دیکھ رہی تھی، جو دائیں بائیں کچھ ڈھونڈتا ہوا، بے تاب نظروں سے ہر میز پر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ایک منٹ رُکیے" وہ مجھ سے بولی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ایک ہاتھ مضمحل سے انداز سے پیشانی پر رکھا۔ میں سمجھا کہ وہ شاید چکرا کر گرنے والی ہے۔ لیکن وہ اس نوجوان کی طرف بڑھ گئی۔
ایک منٹ میں وہ اسے ساتھ لیے میری میز پر لوٹ آئی۔ اس نے ایک کرسی کھینچ کر بڑے تحمّل اور آرام سے اس نوجوان کو بٹھایا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی کرسی کے پیچھے کھڑی رہی پھر خود بھی بیٹھ گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں بن بلایا سا لگتا ہوں۔ میرا تعارف نہیں کروایا گیا۔ اس کی توجہ مکمل طور پر اس گھبرائے ہوئے سے نوجوان کی طرف تھی جس نے ایک لمحے کے لیے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

میں نے کہا "اچھا، میں چلتا ہوں، پھر ملیں گے۔ بائی بائی۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ بیرا آیا اور میں نے بل پر دستخط کیے تو اس نے ایک کپ کافی لانے کا آرڈر دیا۔ کچھ پل بعد بیرے نے کپ نوجوان کے سامنے رکھا اور جب وہ کپ پر نظر جمائے ہوئے کافی پینے لگا تو اس نے ایک لمبا سا سانس لیا، میری طرف دیکھا اور کہا، "بائی — پھر ملیں گے۔"

میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔

کانگڑی عجیب جگہ ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں کوہ پیما، سیاح اور کینیڈا کے طول و عرض سے سیر و سیاحت کی غرض سے یا تعطیلات منانے کے لیے آئے ہوئے لوگ اس شہر کو رونق تو بخشتے ہی ہیں، اس کے ساتھ اس کے قدرتی حسن کو پامال بھی کرتے ہیں۔ ہر چند کہ آنے والے لوگوں میں زیادہ تر گورے ہی ہوتے ہیں تو بھی دولت کی فراوانی کچھ جرائم پیشہ لوگوں کو بھی یہاں کھینچ لاتی ہے جو موقع ملنے پر ہاتھ کی صفائی دکھانے سے باز نہیں آتے۔ اس لیے جب میں ہوٹل سے نکلا اور لگ بھگ پچاس قدم آگے بڑھا تو میں نے دو مشکوک سے نوجوانوں کو قدم قدم چلتے ہوئے اپنے ہمراہ پایا۔ ایک نوجوان جو حبشی نژاد تھا۔ میرے دائیں طرف تھا اور دوسرا جو گورا تھا، بائیں طرف اچانک گورے نوجوان نے چلتے چلتے رومال میں لپٹی ہوئی پستول میری بغل میں ایسے ٹکائی جیسے ایک دوست دوسرے دوست سے بغل گیر ہوتے ہوئے چلتا ہے۔ آہستہ سے اس نے کہا "بٹوا میرے ساتھی کے حوالے کر دو۔"
ایسے موقعوں پر جان بچانے کے لیے بہادری کی نہیں۔ بزدلی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

سائیلنسر لگے ہوئے پستول کو بغل میں محسوس کرتے ہوئے میں نے کہا "گولی نہ چلانا۔ میں اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے کوٹ کی جیب سے بٹوا نکالوں گا اور تمہارے ساتھی کو تھما دوں گا۔ لیکن تم مایوس ہو گے یہ دیکھ کر کہ اس میں صرف پچاس ڈالر ہیں۔"

میں نے آہستہ سے بٹوا نکال کر اس کے حبشی نژاد ساتھی کو تھما دیا، جو فوراً رفوچکر ہو گیا۔ گورا نوجوان اسی طرح میرے ساتھ چلتا رہا۔

"جس لڑکی کے ساتھ تم کافی پی رہے تھے، اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں ــــ میں تو اس سے پہلی بار ہی ملا ہوں۔" میں نے سچی بات کہنے میں عافیت سمجھی۔

"اس سے دور رہو ــــ بہتر یہ ہے کہ اپنی جان بچاؤ اور کالگری سے بھاگ جاؤ۔"

"کیوں؟" میرے ڈر میں اب صرحاگمی ہو رہی تھی۔ "اس سے دور کیوں رہوں؟"

اس نے پستول کی نوک ذرا سختی سے میری بغل میں چبھوئی۔ "دیکھو، تم گورے بھی نہیں ہو اور کالے بھی نہیں ہو۔ باہر کی دنیا کے لگتے ہو۔ تمہارے اندر سمجھ بھی نہیں ہے مافیا کا نام کبھی سنا ہے؟"

"نہیں، میں نے نہیں سنا۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"پوچھ لینا کسی سے۔ اب میں تمھیں چھوڑ کر بائیں طرف کی گلی میں مڑ جاؤں گا۔ میرا ساتھی ایک دروازے کی اوٹ سے تمھیں نشانہ بنائے ہوئے ہے، اس لیے کوئی بے وقوفی کی حرکت نہ کرنا۔ نہیں تو تمھاری لاش یہاں تڑپتی نظر آئے گی۔"

اور وہ ایک لمحے میں ہی رُخ بدل کر گلی میں مڑ گیا۔

بارہ برس تک کینیڈا میں رہنے کے بعد میں اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ معمولی رہ زنی "مگنگ" (سر پر زنی چیز مار کر جیبیں خالی کر کے لے جانا) ایسے جرائم ہیں جن کے لیے پولیس تک جانا اس وقت تک ضروری نہیں جب تک پاسپورٹ یا کریڈٹ کارڈ یا کوئی اور راشد ضروری دستاویز نہ شامل ہو۔ اس لیے میں بدستور اسی چال سے چلتا رہا اور اپنی گھبراہٹ تیز سانسوں اور پیشانی پر چمکتے ہوئے پسینے کے قطروں سے بے نیاز رہا۔ ایک کیفے میں داخل ہو کر اور ایک خالی میز پر بیٹھ کر جب میں نے ساری حالت کا جائزہ لیا تو مجھے دو باتوں کا شدت سے احساس ہوا۔

پہلی بات یہ کہ مجھ سے بٹوا چھیننے والے دونوں رہ زن صرف رہ زنی کے لیے نہیں آئے تھے،

حالانکہ میرے روپے لے لینا انہوں نے غیر مناسب نہیں سمجھا تھا۔

دوسری بات یہ کہ وہ دونوں کسی نہ کسی طرح اس لمبی، گوری، کالی آنکھوں والی اطالوی نژاد لڑکی پر خفیہ نظر رکھے ہوئے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ کوئی اجنبی اس سے تعلق بڑھائے۔ ان کی دھمکی مجھے جان سے مار دینے کی تھی۔ مافیا کی طرف اشارہ اس بات کا مظہر تھا کہ ان کا یا اس لڑکی کا براہ راست تعلق امریکہ اور کینیڈا کی اس غیر قانونی انڈر گراؤنڈ، خفیہ اور بے حد خطرناک آرگنائزیشن سے تھا، جسے کچھ خاندان کنٹرول کرتے ہیں اور جس کے پروگرام میں حارج ہونا، یا جس کی مرضی کے خلاف چلنا یقیناً موت کو دعوت دینا ہے۔ کوئی بھی نارمل شہری مافیا کے نام سے اس طرح گھبراتا ہے جیسے انجانے میں ہی اس نے سانپ کے پھن پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

اس لیے میری گھبراہٹ قدرتی تھی۔

لیکن بارہ برس تک کینیڈا میں رہ کر میں خود اتنے خطروں کو جھیل چکا ہوں، اتنی مصیبتوں سے دوچار ہوا ہوں مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ میں اگر اس معاملے کی تہہ تک نہ پہنچا تو مجھے ذہنی سکون نہیں ملے گا۔ اگر میں ایک انڈسٹریل سیکورٹی کمپنی کے ڈائریکٹر کے عہدے تک بہت دوڑ دھوپ کے بعد پہنچ سکتا ہوں، اگر اس دوڑ میں کئی آدمیوں کو پیچھے چھوڑ سکتا ہوں اور سینکڑوں ان خطروں کو مول لے سکتا ہوں تو اس سیاہ آنکھوں والی لڑکی اور اس کے ساتھی نوجوان کے بارے میں کھوج کرنا شاید میرے لیے اتنا مشکل مرحلہ ثابت نہ ہو گا۔

"ہاں،" میں نے سوچا "میں ضرور کوشش کروں گا۔ لیکن مجھے محتاط رہنا پڑے گا۔"

"کیوں؟" میری ذات کے دوسرے حصے نے مجھ سے سوال کیا۔ "یہ کیوں ضروری ہے کہ میں اس بارے میں معلومات اکٹھی کروں؟ کیا وہ لڑکی مجھے اتنی پسند ہے کہ میں اس سے دوستی کا رشتہ استوار کرنا چاہتا ہوں؟"

"شاید یہ اندازہ درست ہے،" مجھے خود سے جواب ملا۔ "مجھے یہ معلوم کرنا ہی پڑے گا کہ وہ کون ہے؟ ابنارمل سے دکھائی دینے والے نوجوان سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ جن دو نوجوانوں نے مجھ سے میرا بٹوا چھینا اور جو مجھے موت کی دھمکی دے گئے، وہ کیا واقعی مافیا سے تعلق رکھتے ہیں؟ اور اگر ایسا ہے تو وہ لڑکی کس طرح مافیا سے متعلق ہو سکتی ہے؟"

کل پیپر ہوٹل کے ایک پورٹر کو دس ڈالر کا نوٹ اتنا پسند آیا کہ وہ پانچ منٹ میں ہی ساری کہانی سنا گیا۔ مارگریٹ کاروسکی اور اس کے ساتھی نوجوان کے پاس ہوٹل کا سب سے قیمتی سویٹ تھا جس کی بکنگ "جان دانتے" کے نام پر دس دن پہلے کی گئی تھی اور ابھی گیارہ دن اور چلنی تھی۔ جان دانتے شاید اس نوجوان کا نام تھا بکنگ کے بل کی ادائیگی شاید پیشگی بھی کر دی گئی تھی، لیکن شراب کھانا اور دیگر سہولتوں کے بل اور بیروں کے ٹپ کیش ادا کیے جا رہے تھے جو پورٹر کے لیے ایک عجیب بات تھی۔

"صاب، عام طور پر ہوٹل میں ٹھیرنے والے لوگ کریڈٹ کارڈ استعمال ہی کرتے ہیں۔ یہ بہت کم دیکھا گیا ہے کہ ہوٹل کی خدمات کے بلوں کی ادائیگی کیش میں ہو۔ لیکن یہ دونوں . . . . ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ نوجوان میز پر بچوں کی طرح ہی آئس کریم یا چاکلیٹ کے لیے ضد کرتا ہے۔"

"کیا وہ دونوں شادی شدہ ہیں؟"

"کیسے ہو سکتے ہیں صاب؟ وہ اپنا نام مارگریٹ کاروسکی لکھتی ہے اور نوجوان کا نام جان دانتے ہے۔"

کل پیپر ہوٹل کے دوسرے پورٹر نے دس کا نوٹ دیکھ کر نظر انداز کر دیا۔ پھر جب میں نے ایک ایک کے تین نوٹ اور نکالے تو اس نے کہا "ملنے تو کوئی نہیں آتا۔ لیکن ٹورنٹو سے فون اکثر آتے ہیں۔ بات میڈم بھی کرتی ہیں . . . . میں نے ایک دو بار سنا بھی۔ عام طور پر ٹورنٹو سے بولنے والا شخص نوجوان کی خیریت ہی دریافت کرتا ہے اور بار بار پوچھتا ہے کہ وہ خوش ہے کہ نہیں۔"

"کیا نوجوان پاگل ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں میں نے اسے کتاب پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور ڈسکو میں ڈانس تو روز ہی کرتے ہیں۔ ہاں ــ" اس نے احتیاط سے کہا، "شاید ہو بھی سکتا ہے۔"

اس کے بعد میں نے مارگریٹ کے سویٹ کا نمبر دے کر ہوٹل کے ایکسچینج کو فون کیا تو فوراً بات ہو گئی۔ مارگریٹ نے کہا "آپ سے مل کر اس دن کی بات کی معافی مانگنی ہے۔ آپ آ کیوں نہیں جاتے؟ آج شام چار بجے آ جائیے۔"

میں ہوٹل پہنچا تو سروس ڈیسک سے معلوم ہوا کہ سویٹ نمبر ۳۰۳ سے فون پر کوئی جواب

نہیں مل رہا ہے۔ شاید سو رہے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس ہدایت ہے کہ آپ آئیں تو آپ کو اوپر بھیج دیا جائے۔"

میں تیسری منزل پر پہنچا۔ گیلری سے گزرا۔ پھر میں نے سویٹ نمبر ۳۰۳ کا دروازہ آہستہ سے دھکا دیا۔ چٹخنی نہیں لگی ہوئی تھی۔ دروازہ کھل گیا۔ مگر اندر اندھیرا تھا۔

میں نے پکارا۔ "مارگریٹ!"

جواب میں مارگریٹ کی جگہ نوجوان کی آواز سنائی دی۔ وہ بڑبڑا رہا تھا: "ایک کا ایک ہی رہا۔ کہتی تھی کہ چار بن جائیں گے۔ جھوٹ بولتی ہے۔ بہت جھوٹی ہے۔ اب فون پر پاپا سے بات ہوئی تو ضرور شکایت کروں گا۔"

میں غیر قدرتی باتوں میں یقین نہیں رکھتا۔ مگر پاگلوں سے مجھے ہمیشہ ڈر لگتا ہے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ دبا دیا۔ کمرے میں روشنی ہو گئی۔ یہ بیٹھنے اٹھنے کا باہری کمرہ تھا۔ سامنے قیمتی صوفے پر نوجوان اکڑوں بیٹھا تھا۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ مارگریٹ شاید اندر تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس نوجوان کے ہاتھ میں ایک سیب تھا۔

واپس جانا مناسب نہ سمجھ کر میں آگے بڑھا اور صوفے پر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ مسکراتے ہوئے میں نے کہا "کیا بات ہے؟ کیا شکایت کرو گے مارگریٹ کی؟"

اس نے غصّے سے میری طرف دیکھا۔ پھر سیب کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے مجھے دکھایا۔ "کہتی تھی کہ اگر میں سو جاؤں تو ایک کے چار سیب بن جائیں گے۔ بہت جھوٹی ہے۔ جھوٹ بولتی ہے اور پھر مجھ سے کہتی ہے کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔"

اسی وقت مارگریٹ کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ اندر کے کمرے سے آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے سیب تھے، جو اس نے آتے ہی نوجوان کے پاس صوفے پر رکھ دیے۔

"ان بچوں کو اندر سے پکڑ کر لائی ہوں" وہ اس سے بولی "یہ اپنے باپ سیب سے ڈر کر اندر سونے والے کمرے میں بھاگ گئے تھے۔"

نوجوان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ "ونڈرفل! ایک کے چار بن گئے۔" وہ تالیاں پیٹتے ہوئے بولا۔

"اب سو جاؤ، جان! اندر جا کر سو جاؤ! اٹھو گے تو چار کے پانچ بن چکے ہوں گے۔"

جب جان اٹھ کر اندر چلا گیا تو مارگریٹ نے مجھ سے کہا "مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ اس شہزادے کی طرح ہیں جو شہزادی کو دیو کی قید سے چھڑانا تو چاہتا ہے، لیکن قیمت ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس قلعہ تک پہنچنے کے لیے ہوائی گھوڑا نہیں ہے۔"

میں نے جرأت کی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا "مان لو"، میں نے کہا "کہ میں ایک بار شہزادی کو چھڑانے کے بعد اسے اپنے قلعہ میں پھر قید کر دوں تو؟"

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہی رہنے دیا۔ ایک منٹ تک بالکل چپ رہی، پھر بولی "آپ انڈیا کے ہیں مجھے علم ہے کیا آپ انڈیا واپس جا کر وہاں بسنا پسند کریں گے؟"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ بات شہزادی کو قید سے چھڑانے کی تھی، میرے انڈیا واپس جا کر میرے بسنے کی نہیں۔ "آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟ میں سمجھا نہیں۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا "رہنے دیجیے۔ آپ نہیں سمجھیں گے۔"

"لیکن میں سمجھنے کی کوشش تو کر سکتا ہوں۔"

"تو میرے سوال کا جواب دیجیے۔"

اس نے میرے چہرے پر اپنی نظریں جما دیں، جیسے وہاں کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"میں انڈیا واپس جا کر نہیں بس سکتا، مارگریٹ۔" میں نے کہا۔ اور پھر میں نے یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ایک بے کار نوجوان کی طرح میں کیسے کینیڈا پہنچا اور کیسے میں نے اس نئے ملک میں اپنی معاش کا راستہ خود بنایا اور اب جب کہ میں ساٹھ ہزار ڈالر سالانہ تنخواہ تک پہنچ چکا ہوں، انڈیا لوٹنے کے بعد تین ہزار روپیہ ماہانہ کی ملازمت بھی نہیں پا سکتا۔ اور اگر چلا جاؤں تو مجھے کینیڈا کی شہریت اور سکونت چھوڑنی پڑے گی اسی لیے میں نے کہا کہ شہزادے کے پاس ہمت تو ہے، ہوائی گھوڑا نہیں ہے۔" وہ بولی "خیر، اپنا فون نمبر اور ایڈریس دے جائیں۔ مجھے آپ کے لیے کچھ بھیجنا ہے۔"

آدھے گھنٹے کے بعد میں ہوٹل سے نکل کر شاہ راہ تک پہنچا تو میرے پرانے دوست حاضر تھے۔ میرے دائیں اور بائیں منکر اور نکیر کی طرح چلتے ہوئے گورے نوجوان نے مجھ سے کہا، "کوئی بے وقوفی

مت کرنا، انڈین نوجوان! ہم تم سے صرف بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"بولو۔ میں سن رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اپنا ہاتھ اپنی بغل میں لٹکے ہوئے ریوالور کیس سے ذرا دور ہی رکھو؟" وہ بولا "ہمیں علم ہے کہ تم انڈسٹریل سیکورٹی میں ہو اور تمہارے پاس خودکار ریوالور ہے، لیکن کوئی بے وقوفی مت کرنا۔"

"بولو۔" میں نے پھر کہا۔

"تو سنو ۔۔ آلیوتی دانتے کا نام سنا ہے کبھی؟ نہیں سنا تو سمجھ لو کہ وہ مشرقی کینیڈا کے پورے علاقے کے مافیا گھرانے کا چیف ہے۔ ہم اسی کے آدمی ہیں۔ اب پوری بات سمجھ لو۔ مارگریٹ جس نوجوان کی رکھیل ہے وہ آلیوتی کا پوتا ہے۔ اور وہ دماغی طور پر بچہ ہے۔ اس کی ذہنی نشوونما نہیں ہوتی۔ مارگریٹ اس برس ہی نہیں، پچھلے چار برسوں سے اس کی خوشی کا خیال رکھتی ہے۔ تمہاری مارگریٹ میں دلچسپی تمہارے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

میں چپ رہا تو وہ پھر بولا "تمہارا بٹوا جو ہم نے لیا تھا، واپس کر رہے ہیں۔ یہ صرف تمہاری پہچان کے لیے تھا۔ اس میں تمہارے ڈالر اور تمہارا ڈرائیونگ لائسنس اسی طرح رکھا ہے۔ اسے میں تمہاری جیب میں ڈال رہا ہوں۔ اس کے بعد اگر مارگریٹ کے آس پاس منڈلاتے دیکھے گئے تو گولی مار دوں گا۔ بہتر ہوگا کہ کاگیبری سے آج ہی بھاگ جاؤ۔"

میں خاموش چلتا رہا۔ جب منکر اور نکیر میرا ساتھ چھوڑ گئے تو میں ایک بار پھر ایک کیفے میں داخل ہو گیا۔ مجھے شدّت سے اس بات کا احساس ہوا کہ میری تین ہفتے کی چھٹی میں سے بارہ دن پہلے ہی گزر چکے ہیں اور مجھے نو دن کے بعد کام پر حاضر ہونا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی احساس اتنی ہی شدّت سے تھا کہ مارگریٹ سے ملنا اب یقیناً اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ مارگریٹ شاید نہ چاہتے ہوئے بھی مافیا کے چیف کے اس قدر زیر اثر تھی کہ اس کے پوتے کی جنسی ضروریات کا آلۂ کار بننے کے لیے مجبور تھی۔ جان دانتے کا پورا شجرۂ نسب تو مجھے معلوم نہیں تھا۔ لیکن آلیوتی دانتے کے نام سے مناسبت اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اسی خاندان سے ہے۔

کیا میں، ایک ہندوستانی جو اپنے چھتیسویں برس میں قدم رکھ چکا تھا، جس کے پاس ایک معقول تنخواہ والی نوکری اور اس نوکری پر منحصر ایک خوب صورت مستقبل کے سوا اور کچھ نہیں تھا، جس نے اپنی

ہندوستانی جڑیں مدّت ہوئی کاٹ دی تھیں، جو ایک گھر بسانے کے خوش آئند خواب دیکھنے کا آرزومند صرف اس لیے ہوا تھا کہ مارگریٹ میں اس نے اس بے مثال مشرقی حسن کا نمونہ دیکھا تھا جو مغربی عورتوں میں کہیں نہیں ملتا کیا میں جان کی بازی لگا کر مارگریٹ کو آزاد کروا سکتا ہوں؟ کیا یہ ممکن ہے؟

اور اگر ایسا ممکن ہے تو کینیڈا یا امریکہ میں میرا یا مارگریٹ کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ شاید اسی لیے مارگریٹ نے مجھ سے دوبارہ یہ سوال کیا تھا کہ کیا میں انڈیا واپس جا کر وہاں کی شہریت اور سکونت اختیار کر سکتا ہوں۔

مجھے پسینہ آگیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ہلکی ہلکی حرارت ہو۔ بخار کا احساس ہوا تو میں نے ٹیکسی لے کر گھر جانے کا ارادہ کیا۔ گھر پہنچا تو جو پہلی چیز مجھے نظر آئی وہ ایک بڑا پیکٹ تھا جو کوریئر سروس کا ہرکارہ دروازے کے سامنے رکھ گیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا پیکٹ کے نائیلون دھاگے کاٹے تو اندر سے ایک لفافہ برآمد ہوا۔ ایک چٹھی مارگریٹ کی طرف سے تھی اور دو چار کول اسکیچ تھے۔

لفافے کو ایک طرف رکھ کر میں نے پہلے چارکول اسکیچ دیکھے، جو مارگریٹ کے ہی بنائے ہوئے تھے ایک میں ابھرتے ہوئے سمندر کے بیچوں بیچ ایک قلعہ بنا ہوا تھا، جس کی ایک کھڑکی میں سے ایک خوب صورت لڑکی جھانک رہی تھی۔ جیسے دور افق پر کسی غیر مرئی چیز کو تلاش کر رہی ہو۔ دوسرے اسکیچ میں پروں والے گھوڑے پر سوار ایک شہزادہ قلعہ کی دیواروں سے ٹکرا کر نیچے سمندر میں گر رہا تھا اور شہزادی کی کھڑکی کے دروازے بند تھے۔

خط میں لکھا تھا: "تم اگر انڈیا سے آکر مجھے اپنے ملک لے جاتے تو میں خوشی خوشی تمہارے ساتھ گھوڑے پر تمہارے پیچھے بیٹھ جاتی، لیکن تم خود بھی ایک قیدی ہو۔ ہم دونوں کی قید کی کوٹھریاں الگ الگ ہیں۔ میں ایک حیوان کی ہوس کا شکار ہر روز بنتی ہوں۔ تم حالات کے قیدی ہو اور کینیڈا انہیں چھوڑ سکتے۔ الوداع میرے شہزادے! میں آج شام واپس ٹورنٹو جا رہی ہوں۔"

لفافے میں کچھ اور بھی تھا۔ وہ ایک فوٹوگراف تھا۔ مارگریٹ کی ایک بہت خوب صورت تصویر جس میں اس کی سیاہ آنکھیں اس بات کی گواہ تھیں کہ کاکیشین ہوتے ہوئے بھی کہیں اس میں مشرقی خون کی آمیزش ضرور ہے۔

اور اس وقت ایک بار پھر مجھے محسوس ہوا کہ جیسے فوٹوگراف جی اٹھا ہو اور کالی آنکھوں میں کوندا سا لپکا ہو اور دو غزال چوکڑی بھرتے ہوئے راکی پہاڑوں کی چوٹیوں کو پھلانگتے ہوئے دُور نکل گئے ہوں۔

میں ایک آہ بھرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔